گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

سیکولر جمہوری نظام
الیکشن
تحریک اسلامی

مولانا عبدالعلیم اصلاحی

مکتبہ الاقصیٰ - سعید آباد، حیدر آباد

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثریا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا

• سیکولر جمہوری نظام

• الیکشن

• تحریک اسلامی

مولانا عبدالعلیم اصلاحی

مکتبہ الاقصیٰ - سعید آباد، حیدر آباد

تفصیلاتِ کتاب

نام کتاب : سیکولر جمہوری نظام، الیکشن اور تحریک اسلامی

تالیف : مولانا عبدالعلیم اصلاحی

طبع دوم : نومبر ۲۰۰۵ء

کتابت : شکیل کمپوزنگ سنٹر - جدید ملک پیٹ، حیدرآباد۔۳۶

طباعت : عائش آفسیٹ پرنٹرس
سیلر متصل مسجد رضیہ، روبرو فائر اسٹیشن، جدید ملک پیٹ، حیدرآباد۔۳۶
فون: 9391110835 ,24513095 40 91+

قیمت : ۲۰؍ روپے

ناشر

مکتبہ الاقصیٰ

سعید آباد، حیدر آباد

فہرست

۱-انقلاب امامت کا طریقہ کیا ہو ۵
اپنے عقیدہ کے خلاف عمل نہ کیجئے ۵
قرآن کا صریح حکم ۶
انقلاب کا قرآنی طریقہ ۷
ووٹ دینے کا مطلب ۹
ایک سوال ۱۱
ووٹ کارگر نسخہ نہیں ہے ۱۱
الیکشن کے نقصانات ۱۳
اسلام دوستی کا معیار ۱۳
ووٹ دینا باعث گناہ ۱۴
صلح حدیبیہ کا غلط استدلال ۱۵
سہولتوں کا نقصان دہ پہلو ۱۶
انبیاء علیہم السلام کا اسوہ ۱۷
اتباع وحی کا دائرہ وسیع ہے ۱۹
قرآن حکم دیتا ہے ۱۹
دین کی تابعداری ہر حالت میں ۲۱
عقیدہ کی قیمت پر سیاسی اثر کا استعمال ۲۲
حالات نہیں حکم الٰہی کارفرما ہے ۲۲
بدی کو روکنا شرعی حدود میں ۲۳
نادر حکمت عملی ۲۳
اس صدی کا سب سے بڑا المیہ ۲۴
قیصر کے خوف سے کسریٰ کی گود میں بیٹھنا ۲۵
اپنے پیر پر کلہاڑی مارنا ۲۶
۲-بنیادی فکر اور عقیدہ توحید کے خلاف عمل ۲۸
مولانا مودودیؒ کے دو کام ۲۸
آنکھوں میں دھول جھونکنا ۳۱
سیکولرازم اور جمہوریت ڈاکٹر صاحب کی نظر میں ۳۲
انصاری صاحب کے چار دلائل ۳۴
جماعت اسلامی کس چیز کی تائید کرتی ہے ۳۵
آپشن کی بات ۳۵
رب موسیٰ اور فرعون کی اطاعت کا نعرہ ۳۶
اعتراض ۳۷
ایک سوال اور انصاری صاحب کا جواب ۳۷
انصاری صاحب کا اعتراف ۳۹
تحریک کی عمارت کو منہدم مت کیجئے ۳۹
مجلس شوریٰ کی حیثیت ۴۲
علماء کا معاملہ ۴۲
۳-تحریک اسلامی کا مرکزی نکتہ کیا ہے ۴۳
انحراف کی دو علامتیں ۴۳
ہمارے دوستوں کی الجھن ۴۳
باطل کی زمرہ بندی ۴۴
ریاض احمد صاحب کی پیش کردہ آیات پر غور ۴۶
تیسری آیت ۴۸
خطوات شیطان ۴۸
تضاد کی مثال ۵۰
چھوٹا اور بڑا باطل ۵۱
۶۲ کا فیصلہ ۵۲
ریاض احمد صاحب کا اعتراف ۵۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انقلابِ امامت کا طریقہ کیا ہو

انقلاب امامت اور اسلامی انقلاب کا طریقہ کیا ہو؟ یہ سوال اس وقت ایک عالمی سوال ہے ہمارے ملک ہندوستان میں بھی اس سوال نے اب کافی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ ایک بڑی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کے لئے موجودہ الیکشنی سیاست میں داخل ہونا ضروری ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہیں ہے اسی نظریہ کی تائید اور ترجمانی کرتے ہوئے جناب پروفیسر عمر حیات خان غوری ''زندگی نو'' اپریل ۹۸ء میں لکھتے ہیں۔

> ''تحریک اسلامی اقامت دین یا انقلاب امامت کو اپنا نصب العین متعین کر کے سرگرم عمل ہے دنیا میں انقلاب لانے کے چند ہی طریقے ہیں (۱) زیر زمین سازشیں (۲) لاقانونیت (۳) مسلح بغاوت (۴) جمہوری دستوری طریقے۔ ان چار طریقوں میں سے پہلے تین تو تحریک اپنے آغاز ہی سے مسترد کر چکی ہے۔ چوتھی کو اس لئے نہیں اپنا سکتی کہ اس سے عقیدۂ توحید پر ضرب پڑتی ہے، پھر آخر وہ کونسا طریقہ ہوگا جس کے ذریعہ انقلاب امامت ممکن ہو سکے گا''۔

اپنے عقیدہ کے خلاف عمل نہ کیجئے

غوری صاحب نے گویا انقلاب امامت کو جمہوری اور دستوری طریقہ کے ساتھ لازم وملزوم کی طرح محصور کر دیا ہے ان کے خیال میں اس طریقہ کو چھوڑنے کے بعد دوسرا کوئی طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ موصوف اگر یہ کہتے کہ جمہوری طریقہ بھی ایک طریقہ ہے تو بات ذرا آسان ہوتی اور غوری صاحب جیسے لوگوں کو صرف ایک دعویٰ کی دلیل دینی پڑتی۔ مگر اس صورت میں دو باتیں محتاج دلیل بن جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ جمہوری طریقہ بھی کئی طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ ہے ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غوری صاحب نے اپنی اس بات پر غور کئے بغیر، رواروی میں قلم چلا دیا کیونکہ اس بات کو کہنے کا مطلب سابق میں انبیاء علیہم السلام اور سلف صالحین کے اختیار کردہ طریقوں کی نفی ہے یا ان کو منسوخ قرار دینے کا دعویٰ ہے۔

ظاہر ہے یہ بہت بڑا اور سنگین دعویٰ ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور سلف صالحین نے جمہوری طریقہ تو نہیں اپنایا تھا۔ دوسرے جو لوگ جمہوری طریقہ اختیار کرنے کے مخالف ہیں ان کا یہ کہنا ہرگز نہیں ہے کہ یہ طریقہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ اس وقت آپ لوگ جمہوری طریقہ جس طرح اپنا رہے ہیں اس سے عقیدۂ توحید پر زد پڑتی ہے ورنہ اگر کوئی ایسا جمہوری طریقہ اختیار کیا جائے جس سے کوئی شرعی حد نہ ٹوٹتی ہو تو اس کے غلط ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا بذات خود الیکشن غلط اور حرام نہیں ہے بلکہ اس کو حرام بنانے والی بات یہ ہے کہ ایک آدمی ووٹ دے کر کسی کو کتاب وسنت سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کا حق دیتا ہے اور ایک ممبر پارلیمنٹ کیلئے جائز قرار دیتا ہے کہ کتاب وسنت کی پروا کئے بغیر قانون بنائے جبکہ ہمارے عقیدہ میں یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ نہ سمجھے، کسی کو بہ اختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز تسلیم نہ کرے کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے'' (دستور جماعت اسلامی)

قرآن کا صریح حکم

قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (سورۃ النساء ۶۰)

ترجمہ: کیا تم نے ان کی طرف نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس چیز پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی اور اس چیز پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی۔ وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کے پاس مقدمہ لے جائیں۔ حالانکہ انھیں طاغوت کے ساتھ کفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ پوری طرح انھیں گمراہ کرے۔

اس آیت میں دو باتیں بہت واضح طور پر بیان کردی گئی ہیں۔ اول یہ کہ طاغوت کے پاس مقدمہ لے جانا ایمان کے منافی اور سراسر منافقت ہے دوسری بات یہ کہ طاغوت کے ساتھ کفر کرنے کا حکم ہے طاغوت کو تسلیم کرنا، طاغوت کو عزت کا کوئی مقام دینا اہل ایمان کا کام نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ جمہوری نظام اور اس کی پارلیمنٹ طاغوت نہیں ہے؟ جبکہ وہ خدا اور رسول

کے بنائے ہوئے نظام اطاعت کے بالمقابل ایک دوسرا نظام اور قانون وضع کرنے اور چلانے والے ہیں۔ایسی حالت میں ووٹ دینا اوراس کی تشکیل میں شامل ہونا کیا کفر بالطاغوت کے حکم کی صریح خلاف ورزی نہیں ہے؟اور کیا نص قطعی سے ثابت شدہ حکم کا عملی انکار نہیں۔آخر اس کی سنگینی کو کیوں محسوس نہیں کیا جاتا ہے۔

دوسرے مقام پر طاغوت سے اجتناب کا حکم موجود ہے ووٹ دینا اور الیکشنی سیاست میں حصہ لینا اس حکم کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۔(سورۃ النحل ۳۶)

ترجمہ:اور ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔

قرآن ایک طرف اجتناب کا حکم دے رہا ہے اور آپ ہیں کہ طاغوت سے دوستی اور قربت حاصل کرنے سے دس قدم آگے بڑھ کر طاغوت کو قانون سازی کی کرسی پر بٹھانے کی مہم چلاتے ہیں اور تو اور اسی میں ملّت اسلامیہ کی نجات اور فلاح مضمر بتا رہے ہیں گویا قرآن کے نزدیک جو مرض ہے اس کو علاج اور جو گناہ ہے اس کو ثواب ثابت کر رہے ہیں۔

انقلاب کا قرآنی طریقہ

انقلاب امامت کے قرآنی اور انبیائی طریقے کیوں نہیں معلوم کئے جاتے اور ان کو اپنانے کی دعوت کیوں نہیں دی جاتی اور اس کے لئے ان آیات پر غور کیوں نہیں کیا جاتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (سورۃ محمد:۷)

ترجمہ:اے ایمان والو!اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کریگا اور تمہارے قدموں کو جما دیگا۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ (الصافات:۱۱۴،۱۱۵،۱۱۶)

ترجمہ:اور ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا اور ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑی مصیبت سے نجات دی اور ان کی ہم نے مدد کی پس وہ غالب ہوگئے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران:۱۶۰)

ترجمہ: اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ. تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ (سورۃ الصف: ۱۰-۱۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! کیا میں تمہیں بتاؤں ایک تجارت جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے بچائے وہ یہ کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو اور دوسری چیز جس کو تم پسند کرتے ہو اللہ کی مدد اور قریب ملنے والی فتح ہے۔

یہ آیات صاف صاف بتا رہی ہیں کہ نصرت اور غلبہ حاصل کرنے کا طریقہ حق کی مدد کرنے، حق کے واسطے باطل کے مقابل میں جمنے اور ثابت قدم رہنے میں مضمر ہے، دنیا اور آخرت دونوں جہاں کی کامیابی راہ خدا میں جان و مال کے ساتھ جہاد کے ذریعہ حاصل ہوگی نہ کہ باطل کے سامنے جھکنے، کمزوری کا مظاہرہ کرنے اور باطل کی ہاں میں ہاں ملانے سے، بلکہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنی نصرت اور معیت سے محروم کر دیتا ہے۔ جس کے بعد ظاہر ہے دنیا کی کوئی طاقت عزت اور غلبہ نہیں دے سکتی۔

اہل باطل کے ساتھ مودت اور موالات کا رشتہ جوڑنے سے منع کیا گیا ہے۔

لَاتَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ الخ

(سورہ مجادلہ ۲۲)

ترجمہ: تم کوئی ایسی قوم نہ پاؤ گے جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتی ہو، اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت کرتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (سورۃ الممتحنہ: ۱۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! ایسے لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ (سورۂ مائدہ: ۵۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔

اہل باطل سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی کھلی ممانعت ان آیات کے علاوہ کئی آیات میں آئی ہے۔ دوستی تو الگ رہی معمولی جھکاؤ اور میلان پر بھی سخت عذاب کی وعید آئی ہے۔

وَلَاتَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَالَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَاتُنْصَرُوْنَ ۔ (سورہ ھود: ۱۱۳)

ترجمہ: اور ان کی طرف مائل نہ ہو جنھوں نے ظلم کیا پس تم کو آگ چھولے گی اور تمہارے لئے اللہ کے بالمقابل کوئی مددگار نہیں ہوگا پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔

وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ○ اِذًا لَّاَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَاتَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ○ (سورہ بنی اسرائیل: ۷۴، ۷۵)

ترجمہ: اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔

ووٹ دینے کا مطلب

ان قرآنی ہدایات کی روشنی میں انقلاب امامت کے اس طریقہ پر غور فرمایئے جو آپ حضرات تجویز فرمارہے ہیں۔ مودت، موالات اور جھکاؤ کا کیا سوال، آپ تو اہل باطل کو رہنمائی اور قانون سازی کے منصب پر فائز کرنے کی کوشش میں ہیں!۔

فرمایئے ووٹ دینے اور سیکولر پارٹیوں کی تائید کے لئے مہم چلانے کا اس کے علاوہ بھی کوئی مطلب ہوسکتا ہے، دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ کیا یہ رویہ اللہ کے غضب کا باعث بنے گا یا اس کی رحمت کا۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اتنی کھلی ہوئی گمراہی اور کتاب الٰہی سے انحراف کی راہ کو راہ نجات بتارہے ہیں۔ آخر گرنے کی بھی تو کوئی حد ہونی چاہیئے!

انبیاء علیہم السلام کے طریقہ عمل میں تین اصطلاحات دعوت، ہجرت اور جہاد کا نام عام طور پر ملتا ہے۔ اس موضوع پر ایک مفصل کتاب ''دعوت دین اور اس کا طریقہ کار'' تحریک اسلامی کے لٹریچر میں عرصہ سے موجود ہے آخر اس پر کیوں غور نہیں کرتے، اس سے گریز اور کترانے کی روش کیوں اختیار کی جاتی ہے اور قرآن کی صاف اور واضح شاہراہ کو چھوڑ کر پگڈنڈیوں کی تلاش میں

سرگردانی کی وجہ کیا ہے اس سوال کا جواب مولانا امین احسن اصلاحی اس طرح دیتے ہیں۔

''ہر دعوت حق کو کامیابی کی آخری منزل تک پہونچنے کے لئے بالعموم (۱) تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

دعوت.................ہجرت.................جنگ

''اس زمانے میں لوگ زیادہ تر صرف یورپ، امریکہ، روس اور ترکی ہی وغیرہ کے انقلابات سے واقف ہیں، اس وجہ سے سمجھتے ہیں کہ جو مرحلے ان انقلابات میں آئے ہیں وہی ہر انقلاب میں پیش آتے ہیں اور جو طریقے ان انقلابات میں آزمائے جاچکے ہیں ہر انقلاب میں کارگر ہوسکتے ہیں۔ یہ ایک غلط فہمی ہے، جس میں لوگ محض اس وجہ سے مبتلا ہیں کہ ان کے سامنے خالص اسلامی طرز کے کسی انقلاب کی تاریخ نہیں ہے۔ ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ حضرات انبیائے کرام یا ان کے طریق پر کام کرنے والوں کی رہنمائی میں جو انقلاب برپا ہوئے ہیں ان کی خصوصیات ان انقلابات کی خصوصیات سے بالکل مختلف ہیں، جو مجرد سیاسی طرز کی تحریکات سے برپا ہوا کرتے ہیں اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے ہم خالص اسلامی انقلاب کے مختلف مدارج اور اس کے ہر درجہ کی خصوصیات اور تقاضوں پر یہاں بالاجمال گفتگو کریں گے''۔[۱]

(دعوت دین اور اس کا طریق کار صفحہ ۱۹۲)

مولانا اصلاحی کی تحریر کا وزن کم کرنے کیلئے یہ نوٹ لگایا گیا ہے لیکن اس امکان کیلئے ابھی نہ تو کوئی عقلی دلیل کسی جانب سے پیش کی جاسکی ہے اور نہ کوئی تاریخی شہادت موجود ہے بالفرض اس امکان کو تسلیم کرلیا جائے تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ شرعی حدود سے بے نیاز ہوکر جمہوری طریقہ اختیار کیا جائے نیز انقلاب امامت کو الیکشنی سیاست کے اندر محصور کرنے کی کیا دلیل ہے خصوصاً اس وقت جو لوگ الیکشنی سیاست میں حصہ لے رہے ہیں وہ دعوت حق دینے کے بجائے دعوت سیکولرازم اور قیام جمہوریت کا علم بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس دوران کسی طرح بھی یہ بول نہیں بولے جاسکتے کہ انسانیت کے سارے دکھوں کا علاج اللہ کے دین اسلام میں ہے۔

اس لئے کہ یہ بات بولتے ہی میدان سیاست میں داخل ہونے کا سرٹیفکیٹ آپ کے ہاتھوں سے چھین لیا جائے گا اور فرقہ پرستی اور بنیاد پرستی کا لیبل لگ جائے گا۔

۱؎ یہ ''بالعموم'' کا لفظ خاص طور پر پیش نظر رہنا چاہئے ہر دعوت حق کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لئے ان تینوں مرحلوں سے گزرنا لازمی نہیں ہے ورنہ اس جمہوریت کے زمانہ میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ صرف پہلا مرحلہ ہی دعوت کو کامیابی سے ہمکنار کردے۔

ایک سوال

پروفیسر صاحب کا یہ کہنا کہ اگر ووٹ کی سیاست میں داخل نہیں ہوا جائے گا تو اُسّی فیصد لوگ بھی تحریک سے وابستہ ہو جائیں گے تو بھی انقلاب اِمامت نہیں ہوگا اس موقع پر ہم پروفیسر صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ووٹ کی سیاست کو صرف اس لئے تسلیم کرلیا جائے کہ وہ ایک کارگر تدبیر ہے کیا کسی عمل کے کارگر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صحیح ہے اور جس عمل سے مقصد حاصل ہونے والا نہ ہو وہ غلط ہے ہمیں اُمید ہے کہ جناب یہ تسلیم کریں گے کہ صحیح اور غلط کا یہ معیار نہیں ہے اور صحیح اور غلط کا معیار کتاب وسُنّت کے نصوص ہیں۔ کسی عمل کے کارگر اور مفید مطلب ہونے کے تعلق سے سوچنے سے پہلے اس کو کتاب وسنت کے معیار پر جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے یہی وہ پوائنٹ ہے جس کو آج پروفیسرس اور ڈاکٹر حضرات نظر انداز کر دے رہے ہیں اور اُلٹے رخ پر جارہے ہیں جبکہ اس پوائنٹ کو اہمیت دینے والے مولانا مودودیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ، مولانا سید احمد عروج قادریؒ اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے موجودہ الیکشنی سیاست کے تحت ووٹ دینے کو عقیدۂ توحید کے منافی قرار دیا۔

ووٹ کارگر نسخہ نہیں ہے

جہاں تک اس کے کارگر ہونے کا سوال ہے اس پر غور کرلیجئے۔

موجودہ الیکشنی سیاست کے ذریعہ کب تک اور کیوں کر انقلاب امامت ممکن ہو سکے گا اس سوال کو سامنے رکھیئے اور بتایئے کہ ہندوستان کے ساٹھ کروڑ ووٹروں میں سے ہم نے کتنے لوگوں کا ذہن تیار کیا ہے جو اسلامی اُصولوں کے لئے ووٹ دیں گے پورے ملک میں ۵ ہزار ارکان جماعت ہیں ہر رکن کے ساتھ بیس ہم خیال فرض کرلئے جائیں تو ایک لاکھ ووٹر ہوئے اس طرح حساب لگایا جائے تو ہر حلقہ پارلیمنٹ میں ہم نے زیادہ سے زیادہ ۲ سو ووٹر بنائے ہیں یہ پچاس سالہ کارکردگی کا نتیجہ ہے اس رخ سے سوچئے تو ووٹ کے استعمال کے ذریعہ کم از کم ایک ہزار سال درکار ہوں گے بشرطیکہ یہ ہماری موجودہ رفتار کار برابر قائم رہے۔

پھر یہ امکان یوں بھی مارکھا رہا ہے کہ اس وقت آپ اسلام کی ضرورت کا احساس بھی نہیں دلا رہے ہیں بلکہ آپ کی ساری دوڑ دھوپ سیکولرازم اور جمہوریت کے تحفظ اور بقاء کے لئے ہو رہی ہے

اور عوام الناس سے کہہ رہے ہیں سیکولرازم کی بقاء پر ہندوستان کی سلامتی منحصر ہے اس طرح آپ ہندوستان کے لئے اسلام کے بجائے سیکولرازم کو ناگزیر بتارہے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی کوششوں کے ذریعہ عام ذہن یہ بنے گا کہ اجتماعی اور ملکی معاملات میں کسی مذہب کو دخل نہیں دینا چاہئے۔ ورنہ ہندوستان ٹوٹ جائے گا اس مقام پر اپنے دل سے پوچھئے کہ آپ اس عمل سے اسلام کے لئے راستہ بند کررہے ہیں یا اسلام کے لئے راہ ہموار کررہے ہیں؟ کل کے دن آپ کس منہ سے کہہ سکیں گے کہ اسلام کے ذریعہ ہندوستان نجات پا سکتا ہے اور اس ملک میں ہم اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں۔

ان پہلوؤں پر جو بھی ٹھنڈے دل سے غور کریگا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ الیکشنی سیاست انقلاب امامت کیلئے قطعاً مفید مطلب نہیں ہے بلکہ اسلام کیلئے ہندوستان کا دروازہ بند کرنے کا سبب ہے۔

امریکہ، برطانیہ اور ہندوستان وغیرہ ممالک میں الیکشنی سیاست کے ذریعہ جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ صرف ہاتھوں کی تبدیلی ہے نظریاتی حکومت کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اسی کے ساتھ ترکی، الجزائر وغیرہ میں اب تک الیکشنی سیاست کے جو نتائج سامنے آرہے ہیں وہ اس سسٹم کی ناکامی کو مزید یقینی بنارہے ہیں ان ملکوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے پھر بھی انقلاب امامت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ نہایت درجہ ناکام ثابت ہوچکا ہے ایسی حالت میں غیر مسلم اکثریت والے ملکوں میں کیا ہوگا سمجھا جاسکتا ہے۔

تحریک اسلامی کے علاوہ پوری مسلمان قوم شروع ہی سے الیکشنی سیاست میں حصہ لے رہی ہے پچاس سال کی مدت میں کتنے ایم پی مسلمان ہوئے ہیں اور وہ کس قسم کے مسلمان ہیں اور وہ کس طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ غیر مسلم ووٹر کسی مسلمان امیدوار کو شاذ و نادر ہی ووٹ دیتے ہیں البتہ سیکولر پارٹیوں کے مسلم کینڈیڈیٹ کو کبھی کبھار خاص پس منظر میں ہی غیر مسلم ووٹ دیتے ہیں لہٰذا مجموعی اعتبار سے عملاً تحریک اسلامی کے معاون ووٹر مسلمانوں میں سے ہی ملنے والے ہیں۔ اب دیکھئے مسلمانوں میں سے کتنے لوگوں کو تحریک نے اپنی طرف کھینچا ہے وہ اعداد و شمار کی روشنی میں بالکل روشن ہے۔

یہ صورتحال ہے اس میں کس بنیاد پر انقلاب امامت کے لئے الیکشنی سیاست کو اختیار کرنے پر زور دے رہے ہیں۔

الیکشن کے نقصانات

اب تک ہم نے الیکشنی سیاست کے فوائد کے پہلو سے گفتگو کی ہے ذرا نقصانات کو بھی ذہن میں رکھئے۔ جن کا اندیشہ ہے۔

(۱) ابھی محض ووٹ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے کس قدر انتشار فکر کی کیفیت پیدا ہوئی ہے آئندہ جب امیدوار کھڑے کرنے کا سوال پیدا ہوگا تو وہ سارے نزاعات اور جھگڑے پیدا ہوں گے جو سیاسی پارٹیوں میں پیدا ہو رہے ہیں۔

(۲) ابھی الیکشن سے دور ہیں لیکن اس کے لئے مہم کے دوران اللہ اور رسول کا نام لینے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ اسلامی نظام اور اسلامی تعلیمات کا ذکر بالکل مفقود ہے اس کے بجائے جمہوریت اور سیکولرازم کے فضائل خوب خوب بیان ہوتے ہیں۔

(۳) اللہ اور رسول کی مرضی اور آخرت کی فوز و فلاح کے بجائے اپنی ساری اپیلوں کی بنیاد محض ملک کی سلامتی اور یکجہتی کو بنایا جاتا ہے بے دین لیڈروں کی تقریروں اور اپیلوں میں اور ہماری اپیلوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کہ لوگ ہمارے امتیاز کو سمجھ سکیں۔ اس طرح تحریک کی دینی اور اخلاقی ساری امیج خاک میں مل جانے والی ہے اور ذہن و فکر میں اتنی تبدیلی آ چکی ہے کہ اندر اور باہر کے لوگ کھلا ہوا فرق محسوس کر رہے ہیں ابھی تو ابتدائے عشق ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

"ہمارا ووٹ کا حق استعمال نہ کرنا اسلام دشمن فسطائی قوتوں کو تقویت دینا اور کرسی اقتدار تک پہنچانے کے لئے ان کی راہ ہموار کرنا ہے"۔

اسلام دوستی کا معیار

جناب نے ہندوستانی پارٹیوں کو دو خانوں "اسلام دشمن اور اسلام دوست" میں تقسیم کیا ہے۔ آخر اس کی بنیاد کیا ہے۔ اسلام نے دوستی اور دشمنی کا کیا معیار بتایا ہے جس کو دشمن کہہ رہے ہیں وہ تو ظاہر ہے لیکن جس کو دوست بتا رہے ہیں وہ کیسے دوست ہیں۔ کس اصول کے تحت انھیں دوست کہا جا رہا ہے کیا انھیں دوستوں کے زیر اقتدار ہزاروں فساد نہیں ہوئے ہیں، کیا انھیں

دوستوں نے مسلمانوں کی عزت اور آبرو پر سینکڑوں بار ڈاکہ نہیں ڈالا ہے، مسلمان کی زبان کو کس نے ختم کیا۔ مسلمانوں کو کاروبار میں، تعلیم میں اور ملازمتوں میں ہمیشہ پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کس نے کی ہے۔ تحریک اسلامی پر دوبار انھیں نے پابندی لگائی ہے۔ مسلمانوں کے ووٹوں کو بے اثر بنانے کے لئے اسمبلی اور پارلیمنٹ کی خاص انداز میں حد بندی انھوں نے کی ہے مسلمان جہاں جہاں مؤثر ہوسکتے تھے وہاں ان کی آبادی کئی حصوں میں انھیں نے بانٹا ہے بڑی مشکل سے ۵۴۲ پارلیمنٹ حلقوں میں سے ۲۵۔۳۰ حلقے ایسے ہیں جہاں کوئی مسلمان کامیاب ہوسکتا ہے۔

مگر کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کی جاسکتی جہاں کوئی مسلمان غیر مسلم ووٹ سے محض جیت سکا ہو، لہٰذا جن کو آپ دوست کہتے ہیں ان کو دوست سمجھنا آپ کی بنیادی غلطی ہے اور اس غلطی کے نتائج برابر سامنے آتے جارہے ہیں لیکن آنکھ نہیں کھلتی مقام حیرت ہے!

ووٹ دینا باعث گناہ

بالفرض وہ دوست ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دوستوں کی حمایت میں کس حد تک جانا ہمارے لئے درست ہوسکتا ہے کیا ان کی حمایت میں ان کے نظریات اور عقائد کی تائید اور تصویب بھی کرنا ہمارے لئے صحیح ہوگا مثلاً اس وقت ہمارے ملک میں کونسا سسٹم اور نظام موزوں ترین ہے کیا اس سوال کے جواب میں ایک داعی حق ایک لمحہ کے لئے بھی اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نظام اور نظریئے کا نام لے سکتا ہے اور اگر لیتا ہے اور غیر اسلام کے لئے مہم چلاتا ہے تو آپ کے خیال میں اگر صحیح ہے تو ارشاد فرمایئے اس کی دلیل کیا ہے قرآن نے اعلان کردیا ہے کہ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَال یعنی حق کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ضلالت اور گمراہی ہے لہٰذا دعوت اسلام کے علاوہ جس دعوت کی بھی تائید اور نصرت میں آپ مہم چلائیں گے وہ ضلالت کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ اب سوچئے آپ کی مہم برائے بقاء جمہوریت اور آپ کا فورم برائے جمہوریت اور کانگریسیوں اور کمیونسٹوں کی تائید کیا غیر اسلام اور غیر حق کے لئے جہاد میں شامل نہیں ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ ہمارے کسی صحیح اقدام سے باطل کے کسی گروپ کو کسی درجہ میں تقویت ملتی ہے۔ لیکن اس کیلئے کیا جواز ہے کہ بالقصد کسی باطل کی تقویت اور قیام و بقاء کیلئے جدوجہد کی جائے اور بالقصد و ارادہ کسی غلط مقصد کیلئے تگ و دو کرکے خدا کی باز پرس سے ہم بچ سکیں گے؟

آپ بتایئے جس گھڑی دین جمہوریت کے قیام وبقاء کے لئے کوشاں ہوں گے اس وقت اقامتِ دین اور دعوتِ حق کا تصور کہاں ہوگا۔ ووٹ نہ دینا اسلام دشمن طاقتوں کی مدد ہوسکتی ہے جس کے لئے ہم خدا کے پاس معذور ہوسکتے ہیں لیکن ووٹ دے کر کسی باطل کی تقویت کا سبب بہم پہنچانا ایک ایسا جرم ہوگا جس سے بچنے کے لئے ہم کوئی عذر بھی نہیں پیش کرسکتے۔ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والے ارکان پارلیمنٹ حدود اللہ کو توڑیں گے اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے بالمقابل قانون بنائیں گے۔ سودی نظام اور جوا اور شراب کا لائسنس دیں گے تو کیا آپ اس گناہ میں شامل نہ ہوں گے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوا ہے کہ جس فسطائیت سے بچنے کے لئے کچھ لوگوں کو ووٹ دے کر کامیاب کرایا گیا وہی لوگ فسطائیت کے قیام کا سبب بن گئے۔ ۱۹۹۸ء کے پارلیمانی الیکشن میں آندھرا پردیش میں کیا ہوا۔ تلگودیشم کو ووٹ اس لئے آپ نے دیا کہ بی جے پی کا توڑ کیا جاسکے لیکن وہی تلگودیشم بی جے پی حکومت کے قیام کا سب سے بڑا ذریعہ بنی۔ اس طرح تلگودیشم کو ووٹ دینے والے قیام فسطائیت کے گناہ میں شریک ہوگئے۔

صلح حدیبیہ سے غلط استدلال

پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

> ’’رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر مشرکین مکہ سے جو صلح کی تھی اس کا مسلمانوں کو سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہوا کہ انھیں جنگ سے نجات مل گئی تھی۔ پُر امن ماحول میسر آ گیا تھا اور اِس مدت کو انھوں نے دعوت وتبلیغ کیلئے استعمال کر کے ایک بڑے علاقے کو اسلام کی آغوش میں لانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ موجودہ ہندوستان میں ہمیں یہ سہولتیں میسر ہیں ان کی حفاظت کرنے کے بجائے انھیں گنوا دینا نہ دین کی خدمت ہوگی نہ تحریک کی اور نہ ملّت اسلامیہ کی‘‘۔

انگریزی دورِ اقتدار میں پھر اس کے بعد پچاس سالہ جمہوری دور میں دعوت وتبلیغ کا موقع رہا ہے کتنے علاقوں کو ہم آپ اسلام کی آغوش میں لانے میں کامیاب ہوسکے ہیں اسلام کا دائرہ وسیع ہوا ہے یا اسلام کے آثار کے مٹنے میں اضافہ ہوا ہے جس دور جمہوری کے بقاء کے آپ متمنی ہیں اگر وہ پچاس سال مزید رہ گیا تو اسلام اور مسلمانوں کی کیا حالت ہوگی اس کا اندازہ کر کے ملّت کے دردمند حضرات خون کے آنسو رو رہے ہیں اور انھیں مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے

اور آپ لوگ ہیں جو اِسی کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ رہے ہیں۔

صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں یہ نقطہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ صلح کی درخواست رسالت مآب ﷺ نے نہیں کی تھی بلکہ مشرکین کی جانب سے صلح کی خواہش کا بار بار اظہار کیا گیا اور پھر صلح ہوئی۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ صلح کا خواہش مند ہمیشہ میدان مقابلہ سے فرار کی راہ اختیار کرنے والا کرتا ہے اور اس خواہش کا اظہار پسپائی کی علامت ہوتی ہے صلح حدیبیہ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح اگرچہ دس سال کے لئے کی گئی تھی لیکن دو سال میں ختم ہوگئی۔ آنحضور ﷺ نے نہیں بلکہ مشرکین نے یہ کوشش کی کہ معاہدہ کو کسی طرح آگے کے لئے قائم رکھا جائے، دعوت و تبلیغ کے اثرات کا انکار نہیں مگر اصل چیز جس کی وجہ سے دو سال کی قلیل مدت میں اسلام کی قوت میں اضافہ ہوگیا وہ ہے صلح کے نام سے مشرکین مکہ کی شکست کا کھل کر دنیا کے سامنے آجانا، سارا عرب جان گیا کہ قریش مکہ کا دم خم نکل چکا ہے اور عرب کی غالب اور قاہر قوت کا نام اب اسلام ہے پھر کیا تھا، يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا منظر دیکھ کر ساری دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ یہ کہنا کہ امن وامان کی فضاء ہوگئی جس میں دعوت و تبلیغ سے کام لیا گیا غلط ہے دعوت و تبلیغ کا کام تو ہر حالت میں جاری رہا تھا، لیکن اس کی اثر پذیری میں سیلاب اور طوفان جیسی تیزی اس وقت آئی جبکہ مشرکین عرب کی پسپائی کھل کر سامنے آگئی۔ اور یہ معلوم ہوگیا کہ اسلام کے سیل رواں کے سامنے کوئی بندھ نہیں باندھا جاسکتا، دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جو میدان میں ہارتا ہے وہ زندگی کے ہر میدان میں ہار جاتا ہے اور جو میدان میں اپنا لوہا منوالیتا ہے وہ ہر شعبۂ زندگی میں پیش قدمی کرتا ہوا نظر آتا ہے آج ہندوستانی مسلمانوں کے اندر حوصلہ اور اولوالعزمی کے فقدان کے باعث تعلیمی اور معاشی ترقی کے واسطے دانشوران قوم کی ساری تلقینات اور کوششیں بے اثر ثابت ہو رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ملّت کو پہلے کسی طرح اعلیٰ نصب العین کے ذریعے حوصلہ مند بنایا جائے اور پھر اسے نصیحت کی جائے، بے حوصلہ نوجوانوں میں کسی بھی کام کے لئے کہاں سے حوصلہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

سہولتوں کا نقصان دہ پہلو

موجودہ ہندوستان میں جن سہولتوں کا ذکر کیا جاتا ہے ان کی حیثیت درحقیقت نامراد بھکاریوں کو دیئے ہوئے چند ٹکڑوں کی ہے جو تن کو باقی رکھنے کا ذریعہ تو یقیناً ہیں لیکن رفتہ رفتہ روح کا

گلا گھونٹ دینے والے ہیں۔ چنانچہ اب لوگ اس بات کی درخواست کر رہے ہیں کہ حضور والا ہمیں پسماندہ طبقہ میں شامل کیا جائے۔ یہ ذہنی پستی اور زوال اور بے حوصلگی کی کھلی علامت ہے اس کے بعد کیا رہ جائے گا اور کس بنیاد پر ملّت کی تعمیر کی جائے گی۔ ملّت کے بڑے لوگ بس اسی کو غنیمت شمار کر رہے ہیں کہ جو چند ٹکڑے اکثریت کی جانب سے مل رہے ہیں ان کی سپلائی باقی رہے ورنہ ان سے بھی محروم کر دیے جائیں گے تو زندہ کیسے باقی رہیں گے اپنی قوت بازو سے کچھ حاصل کرنے کی فکر ہی نہیں ہے ان ٹکڑوں کی حفاظت کی صورت ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ سیکولر قوتوں کی پناہ میں اپنے آپ کو دے دیا جائے اپنے قدم پر کھڑے ہونا، اپنے بازو میں طاقت پیدا کرنا، اپنی الگ کوئی مستقل حیثیت بنانا، اب خواب وخیال میں بھی نہیں آتا۔

انبیاء علیہم السلام کا اسوہ

پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

> "یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ کسی مملکت میں کسی شہری کو سب سے بڑی سزا جو دی جا سکتی ہے وہ ہے اسے شہری حقوق سے محروم کر دینا جس کے نتیجہ میں دوسرے لوازمات کے ساتھ اسے ووٹ کے حق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے اب اگر ہم خود اس حق سے دست بردار ہو رہے ہیں تو یہ حکومت کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ دوسرے لوازمات بھی ہم پر نافذ کر دے اور یہ نفاذ صرف تحریکی ارکان پر ہی نہیں ہوگا بلکہ پوری اُمت پر ہوگا اور ہمیں اس مظلوم اُمت کو مزید آزمائشوں میں ڈالنے سے گریز کرنا چاہیے"۔

ملّت اسلامیہ کے اصل پیشوا انبیاء علیہم السلام کی دعوتی سرگرمیوں پر نظر ڈالیے۔ یہ حضرات اپنے ملک کے شہری حقوق کے کبھی طالب اور خواستگار کی حیثیت سے سامنے نہیں آئے۔ وہ دینے والے کی حیثیت میں اپنے کو پیش کرتے ہیں وہ کسی کی بالادستی کو ایک لمحہ کے لئے تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے مانگیں اور اس سے توقع رکھیں۔ وہ مکمل طریقہ پر بے نیاز بن کر سامنے آتے ہیں اور دعوت دیتے ہیں۔ وہ مانگیں گے کس سے، جن سے حقوق کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی فرعونیت اور نمرودیت کو وہ چیلنج کرتے ہیں اور اللہ کے نمائندہ کی صورت میں علی الاعلان پکارتے ہیں۔ آ ؤ میری اطاعت کرو۔ میرے تابع بن جاؤ ورنہ تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے سامنے اپنے ملکی اور شہری حقوق کا کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے روبرو شہری

حقوق کا مطالبہ کرتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ اللہ کے یہ بندے اپنا جینا مرنا اللہ کے لئے بنا چکے تھے۔ حالاتِ زمانہ کی کوئی پرواہ کئے بغیر دعوتِ حق کا علم ہاتھوں میں تھامے صرف اللہ کے سہارے، اسی پر توکل کرتے ہوئے اپنے مقصد کے لئے رواں دواں نظر آتے ہیں۔ ان کے اندر یہ یقین جاگزیں تھا کہ جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اسے رزق فراہم کرے گا۔ ان کی ڈیوٹی اپنا فرض ادا کرنا ہے بقیہ سب اللہ کے ذمے ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے دعوتی اسوہ کی روشنی میں یہ حقیقت صاف دیکھی جا سکتی ہے کہ حقوق طلبی والی ذہنیت کے ساتھ کارِ دعوت نہ کبھی انجام دیا گیا ہے اور نہ دیا جا سکتا ہے کیونکہ حقوق طلب کرنے والا گروہ بے شمار لوگوں کو متاعِ غرور کے واسطے اپنا فریق بنا لے گا۔ گویا جس چیز کی طالب ساری دنیا ہے اسی چیز کا طالب وہ بھی ہے دنیا اور آسائش دنیا کا حصول جس طرح سب کی منزل ہے اسی طرح اس کی منزل بھی یہ زندگی اور وسائل زندگی ہیں۔ لہذا داعی اور مدعو میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ لہٰذا جو گروہ انبیائی طریقہ پر کارِ دعوت انجام دینا چاہتا ہے اسے اپنی ذہنیت بدلنی ہوگی اور شہری حقوق کے حصول کو پیش نظر رکھ کر نہ اسے سوچنا چاہئے اور نہ اپنا لائحہ عمل بنانا چاہئے۔ شہری حقوق اور دوسروں کے دیئے ہوئے حق رائے دہی کو قیمتی انعام سمجھ کر اس کی حفاظت کے چکر میں سرگرداں ہوں گے تو اس چکر سے کبھی نکل نہ سکیں گے۔ اس سے انکار نہیں کہ حق رائے دہی ایک قابل قدر اور قیمتی شئی ہے اسے استعمال ہونا چاہئے لیکن کہاں اور کس لئے استعمال ہونا چاہئے۔ پروفیسر عمر حیات خاں غوری صاحب جیسے دانشوروں سے ہم صرف یہ گذارش کرتے ہیں کہ اس ہیرا کو مٹی اور دھول خریدنے کے لئے استعمال نہ کیجئے۔ بلکہ گھی اور شہد اس کے عوض حاصل کیجئے۔ آپ خود غور فرمائیے کیا آپ ایک کمیونسٹ اور کانگریسی کو ووٹ دے کر کمیونزم اور کانگریسیت کے تحفظ اور بقاء کا سامان نہیں کر رہے ہیں یعنی زیادہ سے زیادہ آپ جو کارنامہ انجام دے رہے ہیں وہ ہے ایک فاسد نظام کی جگہ دوسرے فاسد نظام کے اقامت کا کام ہے ایک بُت کو توڑ کر دوسرا بُت کھڑا کر رہے ہیں۔ یہ چکر برابر چلتا رہے گا اور ایک طرف آپ کے گناہ میں اضافہ ہوتا رہے گا اور دوسری طرف جو قوت اقامتِ دین کے لئے صرف ہونی تھی وہ ضائع ہوتی رہے گی اور وہ موقع کبھی نہیں آئے گا کہ آپ کا ووٹ اقامت دین کا ذریعہ بن سکے۔ آپ دس برس یہ نعرہ لگاتے رہیں گے کہ سیکولرزم اور

لادینی جمہوریت ہندوستان کے لئے موزوں ترین سسٹم ہے تو گیارہویں سال کس طرح کہیں گے کہ دین اسلام موزوں ترین نظام ہے۔ جب ایک عرصہ تک پکار پکار کر لوگوں سے کہتے رہیں گے کہ مذہب کو سیاست میں داخل کرنا مہاپاپ ہے جو بی جے پی والے کر رہے ہیں تو کس منہ سے یہ کہنے کی ہمت کریں گے کہ دین کے بغیر سیاست چنگیزی ہے اور اسلام جس طرح مسجد میں ہے اسی طرح پارلیمنٹ اور اسمبلی میں رہے گا۔ الغرض ہم کہتے ہیں حق رائے دہی اقامت باطل کے لئے نہ کیجئے حق کے لئے کیجئے اگر اس کا موقع نہیں ہے تو انتظار کیجئے۔

اتباع وحی کا دائرہ وسیع ہے

غوری صاحب لکھتے ہیں:

"ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جس کا ایک دستور ہے اس دستور کے مطابق حکومت تشکیل پاتی ہے اسی دستور میں دیئے گئے شہری حقوق سے فائدہ اٹھا کر ملک میں لاتعداد سیاسی ،اقتصادی، تہذیبی اور تعلیمی ،لسانی اور مذہبی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں ان میں سے ہر تنظیم اپنا لائحہ عمل و دستور رکھتی ہے ان کی اپنی منتخبہ مجلس انتظامیہ ہوتی ہے اور ان کے اپنے اپنے صدور، ان کے اپنے دستور اور ملکی دستور کے پس منظر میں تنظیم کو چلاتا ہے۔ مجلس انتظامیہ پیش آمدہ معاملات میں فیصلے کرتی اور قانون وضابطہ بناتی ہے صدر اور مجلس انتظامیہ کے فیصلے تنظیم کے سارے ارکان پر نافذ کئے جاتے ہیں اور ہر شخص پر ان کی پابندی لازمی ہوتی ہے ایسی صورت میں غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان تنظیموں کے سربراہوں یا مجلس انتظامیہ کے لئے اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا جاسکتا ہے"۔

قرآن حکم دیتا ہے

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ۔ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (سورۂ اعراف:۳)

ترجمہ: پیروی کرو اس کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور پیروی نہ کرو اللہ کے علاوہ دوسرے اولیاء کی۔ تم کم ہی یاددہانی قبول کرتے ہو۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۔

(سورۃ المائدہ:۴۸)

ترجمہ: بس آپ ان کے درمیان فیصلہ کیجیے اس کے ساتھ جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے حق سے ہٹ کر۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت اور نظام کی اتباع اور پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بتایا گیا کہ اللہ کی شریعت کے علاوہ لوگوں کے اھواء اور خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ غور کیجیے ایک طرف اللہ کا دین اسلام انسانوں کے لئے مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت میں آج محفوظ ہے اس کے ہوتے ہوئے دوسرے انسانوں کے وضع کردہ دستور اور قانون کو ہم خود مانیں اور اس پر عمل پیرا ہوں اور اس کی طرف دعوت دیں تو ہمارے عمل کی سنگینی کا کوئی اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس طرح کی صاف صاف ہدایات کے بعد کسی بھی ملک کے دستور کا اپنے آپ کو تابع بنا کر رکھنا کیا معنی رکھتا ہے موجودہ ملکی دستور کے تحت مختلف لوگ مختلف تنظیمیں بناتے ہیں ان تنظیموں کے صدر، سکریٹری وغیرہ کے احکام کے وہ پابند ہوتے ہیں۔ اس موقع پر یہ بحث بے مطلب کی ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی کیا تعریف ہے اور ان مختلف شکلوں میں کوئی اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے یا نہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اقتدار اعلیٰ ہو کہ اقتدار ادنیٰ کسی پیمانہ کا اقتدار ہو اس کو مستقل بالذات امر ونہی کا حق دینا یا اس کی مطلق اطاعت کرنا شرک کی تعریف میں آئے گا۔ اور دین الٰہی چھوڑ کر لوگوں کی اھواء اور خواہشات کی پیروی بلا تأمل اس کو کہا جاسکتا ہے۔

مزید وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل آیت کو بھی سامنے رکھیے۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ بْنَ مَرْيَمَ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحَانَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (سورہ توبہ۔۳۱)

ترجمہ: انھوں نے اپنے علماء اور فقہاء کو رب بنالیا، اللہ کے علاوہ اور مسیح بن مریم کو حالانکہ انھیں صرف ایک اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سواء کوئی معبود نہیں ہے وہ پاک ہے ان کے شرک سے۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت مطلق ہے اس کے ساتھ کوئی شرط اور قید نہیں لگی ہے لیکن ان کے بعد ہر ایک کی اطاعت کے ساتھ شرط اور قید لگی ہوئی ہے۔ اولی الامر کی اطاعت کا حکم ہے لیکن اللہ اور رسول کی اطاعت کے تحت ہوگی۔ آزاد نہیں۔ حکمراں اور عام مسلمان کے درمیان

جھگڑا ہو سکتا ہے جس کا فیصلہ اللہ اور رسول کے حکم کی بنیاد پر ہوگا۔ کسی شہنشاہ کی اطاعت کا مسئلہ ہو یا کسی جمہوریت کے صدر کا یا کسی تنظیم کے صدر اور سکریٹری کی اطاعت کا مسئلہ ہو سب برابر ہیں جو بھی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے آزاد ہوگی وہ حرام ہوگی جس اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت کی سند حاصل نہ ہو وہ خطوات الشیطان کی اتباع میں شمار ہوگا۔

دین کی تابعداری ہر حالت میں

غوری صاحب لکھتے ہیں:

''کیا اقامت دین کی منزل کے آنے سے پہلے ملک میں کوئی اصول، کوئی قانون، کوئی دستور اور کوئی حکومت نہیں قائم ہونی چاہئے۔ اور اگر ہونی چاہئے تو اس کی شکل کیا ہو''۔

نہیں معلوم اس سوال سے پروفیسر صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ جناب کی یہ منشاء تو ہرگز نہیں ہوگی کہ اقامتِ دین کی منزل آنے سے پہلے کفر و شرک کی حکومت قائم ہونا اور مسلمان کا طاغوتی نظام کا بہی خواہ اور مؤید ہونا حق بجانب ہے۔ اگر یہ کہنا چاہتے ہیں تو کوئی دلیل شرعی پیش کرنی چاہئے لیکن ہمیں یقین ہے کہ پروفیسر صاحب یہ جملے بلا سوچے سمجھے لکھ گئے ہیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی ہر حالت میں دین کی تابع ہوگی۔ چاہے اقامتِ دین کی منزل کتنی ہی قریب ہو یا کتنی ہی دور ہو۔ مسلمان اپنی استطاعت کی حد تک ہمیشہ اللہ کا بندہ بن کر رہے گا اور کسی حالت میں شیطان کی نہ عبادت کرے گا نہ اطاعت۔ مختصر یہ کہ اقامتِ دین کی منزل آنے سے پہلے بھی کسی طرح یہ روا نہیں ہو سکتا کہ اپنی زندگی کے معاملات شیطان اور اولیاء شیطان کے حوالہ کر دے۔ اس کی ذمہ داری حد استطاعت تک ہے۔ استطاعت کے باہر کا جہاں تک معاملہ ہے اس کی خواہش تو یہی ہوگی کہ جو کچھ ہو دین کے مطابق ہو۔ سوچئے ایک مسلمان بہ سلامتی ہوش وحواس یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اقامتِ دین کی منزل آنے سے پہلے پہلے کفر و شرک کا بول بالا ہونا چاہئے اور اللہ کی اطاعت کا نظام قائم ہونے سے پہلے شیطانی نظام اور حکومت ہونی چاہئے لیکن اگر شیطانی نظام قائم ہے تو حتی الوسع اس سے اجتناب کرے گا اور بادل نخواستہ اسے گوارا کرے گا اور اسی حالت میں اپنی منزل تک رواں دواں رہنے کی کوشش کرے گا۔ اگر یہ بھی ممکن نہ رہے گا تو کم از کم اپنی منزل اپنے دل کے سامنے رکھے گا ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اقامتِ دین کی منزل آنے

سے پہلے دین فرعون، دین نمرود یا دین جمہور کی اقامت کے لئے مہم چلانے لگے اور خدا بیزار لوگوں کو قانون سازی کا اختیار دینے لگے اور اولیاء شیاطین کی تابع داری قبول کر کے محض جینے کے لئے مراعات اور سہولتوں کا طالب بن جائے اور جس کی طرف سے چند ٹکڑے مل جانے کی توقع ہو اس کی بولی بولنے لگے۔

عقیدہ کی قیمت پر سیاسی اثر کا استعمال

غوری صاحب لکھتے ہیں:

''غیر مسلم اکثریتی جمہوری ملک میں جس میں مسلمانوں کو بھی مساوی حقوق دیئے گئے ہوں۔ مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہئے اور کیا اس میں ظلم وستم سے بچنے کے لئے اور اسے مزید تخریب کاری سے روکنے کے لئے مسلمانوں کو اپنا سیاسی اثر استعمال کرنا حرام ہے''۔

مسلمانوں کو اپنا سیاسی اثر ضرور استعمال کرنا چاہئے لیکن اسلامی تعلیمات کے حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ واضح رہے کہ ظلم وستم سے بچنے اور تخریب کاری سے روکنا یقیناً کار نیک ہے لیکن اس کے لئے کسی غلط نظریہ اور فکر وعقیدہ کی تائید اور ترویج کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً ظلم اور ناانصافی کے خلاف کوئی فورم بنایا جانا درست ہے مگر فورم برائے جمہوریت اور سیکولرازم بنایا جانا اسلام کی راہ مارنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح سوشلزم اور کمیونزم کی تائید اور حمایت کی جائے اس کی گنجائش ہرگز نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ یہ نظریات انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے اپنے مخصوص قواعد و ضوابط رکھتے ہیں جو روح اسلام کے منافی اور ضد ہیں۔ نیز یہ احتیاط بھی ملحوظ رکھنی ہوگی کہ اپنی گردن میں کسی ایسی اطاعت کا قلادہ ڈالنا جائز نہ ہوگا جو خدا اور رسول کی مرضی کا لحاظ نہ کرنے والی ہو کیا ان باتوں کا آپ لحاظ کر رہے ہیں؟ اور اگر نہیں کر رہے ہیں تو کیوں؟

حالات نہیں حکم الٰہی کارفرما ہے

غوری صاحب لکھتے ہیں:

''تاریخ میں جن حکومتوں نے اسلامی حکومت کا باجگزار بننا تسلیم کر لیا تھا۔ انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا اور دعوت وتبلیغ کے ذریعہ ان میں اصلاح کا عمل جاری کر دیا گیا تھا۔ آج کے دور میں اس کی شکل کیا ہوگی''۔

پروفیسر صاحب نے یہ سوال اس لئے اٹھایا ہے کہ غیر شعوری طور پر ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اس دور میں اسلامی حکومت کا قیام اور پھر غیر اسلامی حکومتوں کا باجگزار ہونا ناممکن ہے حالانکہ جس اللہ نے اسلام کو سابق میں غلبہ واقتدار دیا تھا وہ آج بھی اسلام کو غالب وحکمراں بناسکتا ہے۔ حالاتِ زمانہ سے یہی مرعوب ذہنیت ہے جس نے اچھے اچھے لوگوں کو انحراف کی راہ پر ڈال دیا ہے۔

بدی کو روکنا شرعی حدود میں

غوری صاحب لکھتے ہیں:

''ہمیں ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کے لئے اس کا ہاتھ پکڑنے کی ہدایت کی گئی ہے تو کیا ایسے ملک میں جہاں فسطائی قوتیں اہل ملک کے مختلف طبقات بالعموم اور امت مسلمہ کو بالخصوص ظلم کا ہدف بنائے ہوئے ہیں ایک ایسی حکومت منتخب کرنے میں مدد دینا نہیں چاہئے جو زیادہ انصاف پسند ہو اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے اور اس کی قوت کو توڑنے کے عزم کا اظہار کرے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی''۔

ظالم کا ہاتھ پکڑنے میں کسی کی بھی مدد بالکل روا ہے لیکن صحیح فکر وعمل کے دائرہ میں رہ کر کرنی چاہئے۔ آپ خود سوچئے اگر کہیں ظالم کا ہاتھ توڑنے کے لئے یہ تجویز پیش کی جائے کہ فلاں مقام پر ایک بُت خانہ بنایا جائے جہاں لازماً کچھ لوگ ہر وقت موجود رہیں گے اس طرح ظلم وجور کا راستہ خود بخود بند ہو جائے گا تو ایک مسلمان اس تجویز کی تائید کرے گا یا اس سے کنارہ کشی اختیار کرے گا۔ الغرض ظالم کا ہاتھ پکڑنے کے لئے بھی کتاب وسنّت کے قائم کیے ہوئے حدود کے اندر رہنا ہے۔ اگر یہ تسلیم ہے تو بتائیے فسطائیت کی روک تھام کے لئے غیر اسلام کے قیام وبقاء کی جدوجہد کیسے جائز ہو سکتی ہے؟!

نادر حکمت عملی

غوری صاحب لکھتے ہیں:

''کیا مظلوم کو ظلم سہتے رہنا، خود ہدف ظلم بنا رہنا اور اپنے منفی رویہ سے ظالم کی قوت میں اضافہ کا ذریعہ بنا رہنا دین وشریعت کا مطالبہ ہو سکتا ہے''۔

یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں مسلسل نصف صدی سے ظلم سہنا پڑ رہا ہے اور ہم ظلم کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ کس کی طرف سے۔ کیا اس میں دو رائے ہو سکتی ہے کہ یہ سارا ظلم سیکولرزم اور جمہوریت کا علم اٹھانے والی قوتوں کی جانب سے کیا جا رہا ہے جن کی تائید وحمایت کی مہم آپ حضرات چلا رہے ہیں۔ آخر اتنی کھلی ہوئی چیز کیوں نہیں نظر آتی اور تو اور جس گروہ نے تحریک اسلامی پر دو بار پابندی لگائی ہے اسی کا سایہ اپنے اوپر قائم رکھنے کے لئے آپ حضرات بے چین ہیں۔ یہ نادر حکمت عملی ہے جس کی مثال شاید ہی تاریخ میں مل سکے!

نہ ظلم سہتے رہنا درست ہے اور نہ ظلم کا ہدف بننا صحیح ہے اور نہ اپنے منفی رویہ سے ظالم کی قوت میں اضافہ کا ذریعہ بننا ٹھیک ہے لیکن خاموش رہنا اور منفی رویہ اس لئے اپنایا جائے کہ اگر ہم بولتے ہیں تو راست ایک ظلم اور ایک منکر کی تائید لازم آئے گی تو بتائیے کہ یہ کیوں غلط ہے جب کہ جلب منفعت پر درء مفسدہ کو مقدم رکھنا ایک عام اصول ہے بی جے پی اپنی سوچ اور فکر کے اعتبار سے یقیناً ایک ظالم اور فسطائی گروہ ہے لیکن کانگریس کا ظلم اور فسطائیت بھی ایک کھلی کتاب ہے۔ پچاس برس سے ہمیں اس سے سابقہ ہے اس تجربہ کے بعد بھی ایک مسلمان کے لئے کیا یہ صحیح ہوگا کہ نہ صرف یہ کہ کانگریسی اقتدار کے قیام وبقاء کے لئے بلکہ کانگریسی نظریات اور تصورات کے استحکام کے لئے جدوجہد کرے اور یہ نعرہ لگائے کہ اس کے بغیر ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور یہی موزوں ترین سسٹم ہے۔ آخر اس موقع پر یہ کیوں نہیں سوچا جاتا ہے کہ یہ پالیسی اور رویہ اختیار کرنے سے ہماری اصل دعوت یعنی اسلام کی نفی ہو جاتی ہے اس لئے کہ سیکولرزم کی جو تعریف بھی کی جائے اس کی تعریف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اجتماعی اور سیاسی دائرہ میں کسی مذہب کو دخل دینے کا حق نہیں ہے اور جو گروہ مذہب کو سیاست میں داخل کرے گا اس کو ہم برداشت نہیں کریں گے۔ اب آپ بتائیے کہ سیکولرازم کی تائید کر کے اپنی دعوت کو کالعدم کرنے کیلئے کیسے آپ تیار ہو گئے ہیں اور کیسے اپنی پالیسی کو اقامت دین کی جدوجہد کا ایک جزء کہتے ہیں۔

اس صدی کا سب سے بڑا المیہ

غوری صاحب لکھتے ہیں:

”کیا اس وقت جب آنے والے سیلاب کو ایک تنکے سے روکا جا سکتا ہے خاموش بیٹھے

رہنا اور سیلاب امنڈ آنے پر جوابی سیلاب بننے کا انتظار کرنا جب کہ آنے والے سیلاب کی قوت وطاقت کا اندازہ بھی ہو اور خود جوابی سیلاب بننے کی صلاحیت بھی جانتے ہوں یا بیٹھے انتظار کرتے رہنا، دوراندیشی اور حکمت ودانائی کی تعریف میں آتا ہے"۔

کسی سیلاب کو آتے دیکھ کر خاموش بیٹھے رہنا اور جس حد تک ہم روک سکتے ہیں روکنے کی کوشش نہ کرنا یقیناً حکمت ودانائی کی تعریف میں نہیں آتا! لیکن سوال یہ ہے کہ کسی سیلاب کو روکنے کے نام پر کیا ہم اپنی بنیادی دعوت، بنیادی نظریات اور عقائد کو پس پشت ڈال سکتے ہیں اور کیا ایک سیلاب سے بچنے کیلئے اپنے آپ کو دوسرے سیلاب کے حوالہ کردینا کوئی دانشمندی ہے اور کیا یہ حکمت ودانائی ہوئی کہ خود جوابی سیلاب بننے کیلئے درکار صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنے کی فکر سے ہم خالی ہوجائیں اور فٹ بال کی طرح ایک مارے تو دوسری طرف اور دوسرا مارے تو تیسری طرف لڑھکتے پھریں۔ جیسا کہ پچاس سال سے ہم اس چکر میں پڑے ہوئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چکر سے نہ نکلنے دینے کے لئے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے والوں نے اس گروہ کو بھی اپنے جال میں پھنسالیا ہے جو مسلمانوں کو اس دلدل سے نکال سکتا تھا اور جو مسلمانوں میں جوابی سیلاب بننے کا شعور پیدا کررہا تھا۔ اس پہلو سے حالات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اس صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے اور ملک وملت کی بڑی بدقسمتی ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کی طرف بلارہے تھے وہ انسانوں کے خودساختہ نظاموں کی طرف دعوت دیتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

قیصر کے خوف سے کسریٰ کی گود میں بیٹھنا

غوری صاحب لکھتے ہیں:

"آزمائشوں کے آنے کا خود سبب بننا اور انھیں آتے دیکھ کر بے فکر بنا رہنا اور ان کے روکنے کی تدابیر پر عمل کی فکر نہ کرنا دین داری کی کس تعریف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ کیا جنگ تبوک کا واقعہ آنیوالے سیلاب اور آزمائشوں کا وقت سے پہلے ہی زور توڑ دینے کا درس نہیں دیتا"۔

آزمائشوں کا خود سبب بننا، ان کو روکنے کی تدابیر نہ سوچنا دین داری نہیں ہے لیکن آزمائشوں کے خوف سے صراط مستقیم کو چھوڑنا بھی سراسر دین داری کے خلاف ہے اللہ کے نیک بندے ہمیشہ آزمائشوں میں پڑے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام بھی اپنے آپ کو آزمائشوں سے نہیں بچاسکے ہیں بلکہ سنّتِ الٰہی یہی ہے کہ ہر نیک بندہ آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔ ارشادِ رسول ﷺ کے

بموجب جس کا دین جتنا مضبوط ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی سخت کی جاتی ہے۔ قرآن اہل باطل سے محبت اور موالات کے ساتھ معاملہ کرنے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ مداہنت سے منع کرتا ہے ان کی طرف معمولی جھکاؤ پر سخت وعید سناتا ہے، طاغوت سے اجتناب کو تقاضائے ایمان قرار دیتا ہے اس کے ساتھ مشکلات اور مصائب میں صبر و توکل کی تلقین کرتا ہے اور اس کے فضائل بیان کرتا ہے اور صلہ کے طور پر جنت کی بشارت دیتا ہے۔ قرآن کی ان تعلیمات کی روشنی میں آپ غور فرمائیے اہل باطل کے اصول و نظریات کو اپنے ملک کے لئے موزوں سسٹم بتانا، ان کی کامیابی کے لئے مہم چلانا، ان کو قانون ساز اداروں میں پہنچانے کے لئے ووٹ دینا، کیا مداہنت اور جھکاؤ سے آگے کا قدم نہیں ہے اور محبت اور موالات کے ساتھ فی سبیل الباطل جہاد نہیں ہے؟؟ قرآن کی اتنی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے اللہ کے پاس حاضر ہوں گے تو وہ کونسی دلیل ہے جو آپ کے کام آئے گی!۔ آپ حکمت عملی کے نام پر جو کچھ کر رہے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں اس کا کہیں پتہ نہیں ہے ورنہ کوئی آگ میں نہ ڈالا جاتا، نہ کوئی گھر سے نکالا جاتا، نہ کوئی آروں سے چیرا جاتا اور نہ معرکۂ بدر و حنین جیسے معرکے گرم ہوئے ہوتے۔

جنگ تبوک کا ذکر کر کے تو آپ نے اپنے موقف کو انتہائی کمزور کر دیا ہے کاش جنگ تبوک کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ لیتے۔ جنگ تبوک کے موقع کی کوئی بات تو بتایئے۔ جس سے ظاہر ہو رہا ہو کہ آزمائش سے بچنے کے لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے باطل اور اہل باطل کی ہمنوائی اور تائید کی ہو اور قیصر کے ڈر سے کسریٰ کی گود میں بیٹھنے کی کوشش کی ہو، اس کے برخلاف جس تیاری اور مستعدی کے ساتھ اور جن مشکل اور نازک حالات میں آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لئے مدینہ سے آپ نکلے ہیں اور صحابہ کرام نے جس ایثار اور قربانی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے آپ کی حکمت عملی کا کیا تعلق ہے کسی حقیقت کو جھٹلانے کی اس سے بڑی مثال مشکل سے ملے گی۔ ایک طرف ایثار، قربانی، پامردی، حوصلہ مندی اور جرأت اور اقدام ہے اور دوسری طرف بے ہمتی، خوف، ڈر، بزدلی اور فرار ہے اور دونوں کو ایک قرار دیا جا رہا ہے افسوس صد افسوس۔

اپنے پیر پر کلہاڑی مارنا

غوری صاحب لکھتے ہیں:

"ملک میں ایسی حکومت کی راہ روکنا جو دعوت دین کا راستہ روکنے والی ہو، دین حق اور اس کی ترویج و توسیع میں معاونت نہیں ہوگی"۔

دعوتِ دین کی راہ روکنے والی حکومت کی راہ روکنا یقیناً واجب ہے لیکن اپنے عقیدہ اور آئیڈیالوجی کی نفی کرکے ہرگز صحیح نہیں ہوگا اگر اس طرح کی حکومت کی راہ اس بنیاد پر روکی جائے کہ خدا کے دین کی حکومت قائم ہوگی یا فلاں خدا پرست اور صالح گروہ کے لوگوں کو برسر حکومت آنا چاہئے۔ تو ٹھیک تھا مگر آپ اس حکومت کی راہ اس نعرہ کے ساتھ روک رہے ہیں کہ ہندوستان کیلئے موزوں نظام، جمہوریت اور سیکولرازم ہے اور حکومت کانگریسی فکر اور سیکولرزم کے حاملین کی ہونی چاہئے وہ کانگریس جو دوبار دعوتِ دین کی راہ روک چکی ہے جس کے دور حکومت میں ہزاروں مسلم کش فسادات ہو چکے ہیں اور کسی ایک مجرم کو سزا نہیں دی گئی جس نے پوری کوشش کی ہے کہ مسلمان اپنا تشخص کھو دیں۔ جس کانگریس نے بابری مسجد کو تالا لگایا، اور پھر چالیس سال کے بعد اسی نے پوجا پاٹ کرانے کیلئے تالا کھولا اور آخر میں اسی نے مسجد کی جگہ مندر بنانے کا موقع فراہم کیا۔

ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ کی حکمت عملی کے معنی اپنے ہی پیر پر کلھاڑی مارنا ہے کیونکہ ایک طرف آپ بڑے زور سے کہتے ہیں کہ دعوت دین کے لئے فرقہ وارانہ ہم آہنگی ضروری ہے اور قومی منافرت کی فضاء ختم ہونی چاہئے لیکن دوسری طرف ملک کی اصل ہندو اور سب سے بڑی پارٹی کے خلاف غیر مذہبی لوگوں کے حق میں مہم چلا رہے ہیں اور اپنی دعوت اور اسلام کا پیغام پس پشت ڈال کر ایسا کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جہاں اسلام کا نام لیں گے وہیں غیر مذہبی یعنی سیکولر لوگوں کے کان کھڑے ہو جائیں گے اور ان کی نظر میں آپ اور بی جے پی کے لوگ دونوں برابر ہو جائیں گے۔ غرض دعوت دین کی راہ روکنے والی حکومت کی راہ روکنے کا ایسا طریقہ اپنایا گیا ہے جس میں پہلے ہی قدم پر خود ہمیں ہی دعوت دین کو روکنا پڑ رہا ہے۔ یعنی جو کام بی جے پی کرتی وہ کام خود ہم ہی کر رہے ہیں۔ فرق صرف عنوان کا ہے۔

دعوتِ دین کی راہ میں دشواریوں میں اضافہ کرنا اور آزمائشوں کے آنے کے راستے کھلے چھوڑ دینے کو یقیناً دانش مندی نہیں کہا جا سکتا اور نہ مومنانہ فراست، لیکن اس سے بڑی بے دانشی اور بدبختی یہ ہے کہ سہولتوں اور آسائشوں کی خاطر صراط مستقیم سے ہٹ کر عذاب الٰہی کو دعوت دی جائے۔

بنیادی فکر اور عقیدۂ توحید کے خلاف عمل

ووٹ اور الیکشن کے بارے میں کم وبیش تیس سال سے چلنے والی بحث کو ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب نے ایک مقام تک پہنچا دیا ہے۔ جہاں کئی بنیادی باتیں تقریباً متفقہ حقیقت بن گئی ہیں۔

(۱) مثلاً سیکولر جمہوری نظام میں قانون کا ماخذ صرف جمہور کا اجتماعی ارادہ ہوتا ہے اس کے اوپر اور کوئی اتھارٹی اور سند نہیں ہوتی، نہ انسانی اور نہ خدائی۔ اس کی بنیاد حاکمیت الٰہ کے انکار اور حاکمیت جمہور کے اقرار پر ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ایک کافرانہ اور طاغوتی نظام ہے۔

(۲) دوسرے اس نظام کو جائز اور برحق تسلیم کرنا اور ماننا ایمان کے منافی ہے۔

(۳) تیسرے اس نظام کو چلانے کیلئے اسمبلی اور پارلیمنٹ میں جانا ہماری بنیادی فکر اور عقیدہ توحید کے خلاف ہے۔ اس کے بعد کے مباحث کی تنقیح کیلئے ہم ڈاکٹر انصاری صاحب کے مضمون "زندگیٔ نو۔ جون ۹۸ء" پر تفصیلی بحث کریں گے۔ یہ مضمون کتابی شکل میں بھی "سیکولرازم، جمہوریت اور انتخابات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، مرکزی مکتبہ اسلامی نے شائع کیا ہے۔

مولانا مودودیؒ کے دو کام

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

"ترجمان القرآن" کی زندگی کے ابتدائی چار سال اس کوشش میں صرف ہوئے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں گمراہی کی جو جو شکلیں پیدا ہوگئی ہیں ان پر گرفت کی جائے اور اسلام سے جو روز افزوں بعد ان میں پیدا ہو رہا ہے اسے روکا جائے۔ (۱)

میری کتاب "تنقیحات" اس کوشش کا آئینہ ہے۔

"ابھی یہ کوشش جاری تھی کہ ۳۷ء میں یکا یک یہ خطرہ سامنے آ گیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اس وطنی قومیت کی تحریک کا شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظام حکومت کے خواہ کتنے ہی

مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اس کے پنجے سے نکلنے کی خواہش چاہے کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس وقت تک تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقۂ اثر میں ہیں ان کو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی ربط عوام کی تدبیروں سے، اور اپنی وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کے ذریعہ سے، اور اپنے سیاسی ومعاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کر لے، اور ان کے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کر دے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان یا امریکہ میں ہے۔ اس خطرہ کو اور زیادہ پریشان کن جس چیز نے بنا دیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ بااثر طبقہ وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔ لہذا اس خطرے کا سد باب کرنے کیلئے میں نے ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۳۷ء کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۳۹ء کے آغاز میں شائع کیا ان مجموعوں میں میرے پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبے سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخص کو گم نہ کر دیں۔ اس لئے میں نے ان کے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان کو اس جمہوری لادینی نظام حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضہ پر ہندوستان میں قائم کیا جا رہا تھا۔ ان آئینی تحفظات اور بنیادی حقوق کی حقیقت واضح کی جن پر اعتماد کر کے مسلمان اس مہلک جمہوری دستور کے جال میں پھنسنے کیلئے آمادہ ہو رہے تھے''۔

چند سطروں کے بعد مولانا پھر لکھتے ہیں:

''یہ کام جس غرض کے لئے کیا گیا تھا اللہ کے فضل وکرم سے وہ پچھلے دو تین سال میں حاصل ہو چکی ہے اور اب اس امر کا کوئی خطرہ باقی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی وطنی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں گے یا اپنے آپ کو کسی ایسے جمہوری نظام میں نتھی کرالیں گے جو واحد قومیت کے مفروضہ پر تعمیر کیا گیا ہو''۔

لیکن مولانا علیہ الرحمۃ کو کیا معلوم تھا کہ ان کی آنکھ بند ہونے کے صرف پانچ سال بعد انھیں کی برپا کی ہوئی تحریک کے ذمہ دار اور نمائندے مسلمانوں کو اسی جال میں پھنسانے کی کوشش شروع کر دیں گے جس جال سے نکالنے کے لئے مرحوم نے جان توڑ محنت کی تھی اور انہی کی تحریروں

سے یہ ثابت کریں گے کہ مولانا لادینی جمہوری نظام کے داعی اور مبلغ تھے قارئین نے ''زندگی نو'' جون ۹۸ء میں پڑھا ہوگا کہ ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب نے قاسم رضوی کے نام مولانا کے ایک خط کے حوالے سے اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب نے مسئلہ فلسطین کے تعلق سے مولانا کے ایک بیان سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا مودودیؒ لادینی جمہوری نظام میں شرکت کے مخالف نہیں۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے جس پر افسوس کے علاوہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

مولانا مودودیؒ کی ہزاروں صفحات پر مشتمل تحریریں جس چیز پر کھلے طور پر گواہی دے رہی ہیں اور جس کی عملی شہادت جماعت اسلامی نے تقریباً نصف صدی تک دی ہے اس کے خلاف کسی خط اور کسی بیان کو پیش کرنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں سے عرس اور قوالی کے کار ثواب ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔

معاہدہ کرنے اور کسی نظام میں شریک ہونے اور اس کے ساتھ ضم ہونے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے جسے محسوس کرنا چاہئے تھا۔ مولانا مودودیؒ کی دونوں تحریروں میں معاہدہ کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ معاہدہ میں ہر فریق کی اصل حیثیت اور اس کا اپنا تشخص تسلیم شدہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کس نے دب کر معاہدہ کیا ہے اور کس کی پوزیشن مضبوط ہے۔ مولانا نے کسی کے ساتھ ضم ہونے اور کسی نظام میں ضم ہونے کی بات ہرگز نہیں کی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستانی جمہوری نظام میں مسلمان بہ حیثیت اُمت مسلمہ نہیں شریک ہو رہے ہیں اور نہ دستور کے لحاظ سے اس کی گنجائش ہے۔ یہاں مسلمان کو متحدہ قومیت کا ایک جزء فرض کر لیا گیا ہے اور اس کو ڈاکٹر صاحب جیسے لوگوں نے بھی قبول کر لیا ہے لیکن مولانا اس کے مخالف تھے۔ بقول ڈاکٹر صاحب مولانا مودودیؒ کی بات میں سلطنت در سلطنت کی بات ہے۔ غور فرمائیے موجودہ ہندوستان کی صورت حال میں کیا مسلمانوں کا سیاسی رول سلطنت در سلطنت کے قیام کا ہے اس پہلو سے مکرر غور کرنے کی ڈاکٹر صاحب سے ہم خواہش کریں گے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقامتِ دین اور نظام اسلامی کے داعی کے بجائے مولانا مودودیؒ کو لادینی جمہوری نظام کا مؤید ثابت کرنا بڑی بے انصافی کی بات ہے اور مولانا پر بڑا ظلم ہے۔

اسی بے انصافی کا دوسرا نمونہ ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب کے یہ جملے بھی ہیں۔

''مولانا مودودیؒ کی بعض تحریروں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کے بارے میں ہمارا جو اصولی موقف ہے، اسکی روشنی میں اس نظام کے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے الیکشن میں کسی طرح کا حصہ لینا جائز نہیں۔ خواہ اس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے کتنے ہی مفادات متاثر ہوں یا انھیں کتنے ہی غیر معمولی نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہو''۔

(''زندگی نو'' جون ۹۸ء)

آنکھوں میں دھول جھونکنا

''تاثر ملتا ہے'' کے الفاظ ذہن میں رکھیئے اور مولانا مودودیؒ کے یہ صریح الفاظ پڑھیے اور دیکھیے کس طرح آنکھوں میں دھول جھونکی جارہی ہے۔

''دوم یہ کہ ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کرلیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے اسی طرح کے انتخابات کی اہمیت جو کچھ ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بناء پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کرلیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ کافرانہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے۔ جس کے لئے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے اگر ہندوستان کے علماء اور عامۃ المسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کے لئے مقتضیات ایمانی سے اہم تر بن گئی ہیں تو اس کی جواب دہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشہ سے اس اصولی مسئلہ میں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کرسکتے۔ آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر کس طرح انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لئے یہ جائز ہوسکتا ہے کہ ایک

طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے ان لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے اختیارات غصب کرنے کیلئے اسمبلیوں میں جانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لئے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہئے۔ جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے"۔ (رسائل مسائل اول)

سیکولرازم اور جمہوریت ڈاکٹر صاحب کی نظر میں

''ایک سیاق میں' مذہب انسان کا صرف ذاتی اور نجی مسئلہ ہے۔ خدا کی ہدایت یا آسمانی کتاب کا تعلق صرف اسی حصے سے ہے جہاں تک اجتماعی اُمور کا تعلق ہے، وہ مذہب سے آزاد اور خدائی ہدایت سے بے نیاز ہیں۔ اس دائرے میں تمام فیصلے انسانوں کو اپنی عقل اور تجربے کی روشنی میں انجام دینے چاہئیں، نہ کہ کسی آسمانی کتاب یا ہدایت کی روشنی میں۔

دوسرے سیاق میں سیکولرازم آج کی مختلف ریاستوں کا ایک اساسی تصور ہے یعنی یہ کہ جو اجتماعی اُمور ریاست کی حدود میں آتے ہیں، ان میں ریاست ہر خدائی ہدایت اور مذہبی رہنمائی سے کلیۃً آزاد ہوگی۔ اس کے سارے قوانین اور ضابطے سارے اصول اور پالیسیاں اور تمام فیصلے ریاست کے شہری اپنی عقل و تجربے کی روشنی میں طے کریں گے"۔

''ہندوستان کی ریاست ایک سیکولر ریاست ہے اس کا اساسی تصور یہ ہے کہ اجتماعی اُمور میں حکومت کسی مذہب یا الٰہی ہدایات کی پابند نہیں ہے۔ اسکے تمام قوانین و ضوابط اور سارے فیصلے اُصولاً اسکے باشندوں کی مرضی کے مطابق اور ان کی عقل و تجربے کی روشنی میں طے پائیں گے"۔

''جمہوری ریاستیں اس اساس پر قائم ہوتی ہیں کہ حاکمیت (Sogereignty) کے حق دار ریاست کے جمہور عوام ہیں یعنی قانون کا ماخذ نہ کوئی خاندان ہے، نہ کوئی طبقہ اور نہ کوئی گروہ یا فرد۔ اس کا ماخذ صرف اور صرف جمہور کا اجتماعی ارادہ ہے، اس سے اوپر اور کوئی اتھارٹی نہیں۔ نہ انسانی اور نہ خدائی، جمہوری ریاست اور اسلامی حکومت میں بنیادی فرق اسی نکتے پر ہے"۔

ڈاکٹر صاحب نے سیکولر جمہوریت کا جن الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔ ان کی موجودگی میں سیکولر جمہوریت کے ایک کافرانہ اور مشرکانہ طاغوتی نظام ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کافرانہ نظام کے تحفظ و بقاء اور قیام کی مہم چلانے کے لئے کہاں سے گنجائش نکلتی ہے جب جمہوری نظام سے بڑھ کر صریح اور کھلا ہوا کفر کیا ہوسکتا ہے اگر اس کفر بواح کی تائید و حمایت کی جاسکتی ہے تو بتایئے وہ کونسا کفر اور کافرانہ نظام ہوگا جس کے مٹانے کی جدوجہد ایک مسلمان کا فریضہ ہوگا۔ اور اس سے بڑا وہ کونسا منکر ہوگا جس کو ختم کرنے یا کم از کم دل سے ناپسند کرنا، ایمان کی علامت بتائی گئی ہے۔

بالخصوص ایک ایسا مسلمان جس نے اقامتِ دین کو اپنا نصب العین بنایا ہو اور دین کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں جاری و نافذ کرنا جس کی ساری دوڑ دھوپ کا ماحصل ہو، اس کے متعلق یہ کس منطق، کس عقل اور کس شرعی دلیل کی بنیاد پر تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک لمحہ کیلئے اس طاغوتی نظام کے قیام و بقاء کی بات سوچ سکتا ہے۔ چہ جائے کہ وہ اس کے لئے مہم چلائے اور فضا ہموار کرے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس طاغوتی نظام کی تائید و حمایت کو جائز قرار دینے کا فریضہ انجام دیا مگر اس کے لئے نہ قرآنی آیتیں پیش فرما سکے، نہ کوئی حدیث اور نہ کوئی شرعی اصول۔

ڈاکٹر صاحب کے دلائل انھیں کے لفظوں میں ملاحظہ ہوں۔ روداد شوریٰ سے ایک اقتباس درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''آپ ان الفاظ پر غور کریں پہلی چیز جو آپ کو نوٹ کرنی چاہئے وہ یہ ہے کہ یہاں جو بات زیر بحث ہے، وہ حاکیت جمہور کا نظریہ نہیں ہے، بلکہ جمہوریت کی آزادی رائے و ضمیر جیسی قدریں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ شوریٰ جمہوریت کی انھیں قدروں کی تائید کر رہی ہے نہ کہ اس کے نظریۂ حاکیت کی۔ تیسری بات یہ ہے کہ شوریٰ اگر ہندوستان میں جمہوریت کی بقاء اور فروغ کی کوشش کرتی ہے تو اس کی ایک وجہ آزادیٔ رائے و ضمیر کا تحفظ ہے جو جمہوریت میں بھی ویسے ہی محترم ہیں جیسے کہ اسلامی ریاست میں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آزادی نہ صرف ملک کی صحیح تعمیر و ترقی کے لئے ضروری ہے بلکہ جماعت اسلامی کی اپنی سرگرمیوں اور دعوتی و تحریکی کوششوں کے جاری رہنے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ چوتھی بات جو الفاظ سے سامنے آتی ہے وہ جماعت اسلامی کا یہ اندیشہ ہے کہ اگر جمہوریت کی تائید نہیں کی

گئی تو کلیت پسندی اور آمریت کے رجحانات ترقی پائیں گے۔جس سے ملک کی ترقی بھی متاثر ہوگی اور جماعت اسلامی کی دعوت بھی۔اس احساس کے تحت جماعت اسلامی جمہوریت کی نہ صرف زبانی تائید پر اکتفا کرنا چاہتی ہے، اس کے لئے رائے عامہ بھی ہموار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے''۔

انصاری صاحب کے چار دلائل

ڈاکٹر صاحب کی پہلی بات کو لیجئے۔سوال یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کا نظریہ کیوں زیر بحث نہیں لیا گیا جبکہ جمہوریت کی جان حاکمیت جمہور ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہندو مت کی تائید وحمایت کا مسئلہ ہو اور کہا جائے کہ بُت پرستی کا مسئلہ زیر بحث نہیں ہے۔آخر کیوں؟ دوسری دلیل پر غور کیجئے کہ گویا آپ جمہوریت کی آدھی چیز کی تائید کرتے ہیں۔آپ آدھی کے بارے میں کیا کہتے ہیں وہ بھی تو معلوم ہونا چاہئے۔الیکشن کے زمانہ میں جب مہم چلائی جاتی ہے تو کیا اس کی صراحت کی جاتی ہے کہ ہم جمہور کی حاکمیت کو نہیں مانتے اور کیا ایک کمیونسٹ یا کانگریسی امیدوار کو آپ پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں تو اس کو یہ بول کر بھیجتے ہیں کہ دیکھو تم صرف جمہوری قدروں کے حق میں رائے دینا اور حاکمیت جمہور کے خلاف بولتے رہنا۔

تیسری دلیل کو دیکھئے: آزادیٔ رائے وضمیر کا تحفظ بلاشبہ محترم شی ہے لیکن کیا اس کی حفاظت کے لئے حاکمیت الٰہ کو چھوڑ کر حاکمیت جمہور کو قبول کرنا اور اس کے قیام کی جدوجہد شرعاً جائز ہوگی۔ حالانکہ حاکمیت الٰہ کا عقیدہ تو وہ شئی ہے جس کے لئے رائے اور ضمیر کیا جان ودل سب کچھ قربان کردینے کی تاریخ موجود ہے اور جان ودل اور اپنی ساری متاع ایک مومن جنت کے عوض فروخت کرچکا ہوتا ہے۔

جہاں تک ملک کی صحیح تعمیر وترقی کا سوال ہوسکتا ہے کہ جمہوریت کی دی ہوئی آزادی پر موقوف ہو لیکن جہاں تک دعوتی وتحریکی کوششوں کے جاری رہنے کی بات ہے اس کا سوال بھی کیا ہے جب کہ حاکمیت الٰہ کے بجائے حاکمیت جمہور کو قبول کرلیا جائے اور دین جمہور کے قیام کی مہم شروع کردی جائے۔آخر دعوت وتحریک کس چیز کا نام ہوگا اور کس چیز کی دعوت دی جائے گی اور کس چیز کے لئے تحریک چلائیں گے؟؟ آپ کی چوتھی دلیل ایک اندیشہ ہے کہ اس اندیشہ کی بنیاد پر

حاکمیت الٰہ کے عقیدہ سے دست برداری اختیار کرلیا جانا روا ہوگا؟ دعوت اسلامی کی تاریخ میں نمرود اور فرعون کی کلیت پسندی اور آمریت کی چیرہ دستیوں اور اذیتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ گوارہ کیا گیا لیکن حاکمیت الٰہ کی عقیدہ کے کسی چیز سے دست برداری کی سوچ کو قریب آنے نہیں دیا گیا۔ یہ کونسی انوکھی آمریت ہے اور اس کا کیا خوفناک اندیشہ ہے کہ ہم ایمان کی اس کمزوری کا مظاہرہ کررہے ہیں۔

جماعت اسلامی کس چیز کی تائید کرتی ہے

"جماعت اسلامی کی شوریٰ کی قراردادوں میں جمہوریت کی جو تائید ملتی ہے، وہ صرف اس جمہوری طرز حکمرانی، ان جمہوری قدروں کی تائید ہے جو جمہوریت اور اسلامی ریاست دونوں میں مشترک ہے، نہ کہ حاکمیت جمہور کے نظریہ کی"۔

اگر یہ بات ہے تو ان کمیونسٹ اور کانگریسی امیدواروں کو کیسے ووٹ دیا جاتا ہے جو مکمل جمہوریت پر ایمان رکھتے ہیں اور جمہوریت کے کسی ایک جزء کے بھی انکاری نہیں ہیں آخر ایسے لوگ جماعت اسلامی کی نمائندگی پارلیمنٹ میں کیسے کرسکتے ہیں۔

آپشن کی بات

مجلس شوریٰ جماعت اسلامی کی ایک قرارداد سے کچھ حصہ نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> "اس اقتباس سے چند چیزیں بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ جماعت اسلامی اگر سیکولر جمہوری نظام کی بقاء کی تائید کرتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سیکولر جمہوریت اسے مطلوب ہے یا اس کا نصب العین ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے سامنے جو دو آپشن ہیں ان میں بہتر آپشن یہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا آپشن وہ ہے، جو ملک وملت دونوں کے لئے خطرناک اور جماعت کی دعوت کے لئے ضرر رساں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جماعت کی یہ تائید وقت ہے مطلق نہیں، یہ تائید اس وقت تک ہی باقی رہے گی جب تک اہل ملک کے سامنے جماعت کا اپنا نصب العین ایک آپشن کے طور پر نہ آجائے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ جب تک وہ وقت نہیں آتا جماعت اپنے نصب العین کی طرف دعوت بھی دیتی رہے گی اور ساتھ ساتھ اس کی بھی کوشش کرتی رہے گی کہ ہندوستانی

ریاست کا سیکولر جمہوری کردار باقی رہے تاکہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن رہے اور جماعت کیلئے اپنی دعوت کا دروازہ کھلا رکھے"۔

ربِ موسیٰ اور فرعون کی اطاعت کا نعرہ

اس سے پہلے ڈاکٹر صاحب کی یہ بات ہم نقل کر آئے ہیں کہ جماعت اسلامی مکمل جمہوریت کی تائید نہیں کرتی بلکہ صرف جمہوری طرز حکمرانی اور جمہوری قدروں کی تائید کرتی ہے لیکن یہاں کہا جارہا ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کی تائید کرتی۔ اس تضاد بیانی کی اس کے علاوہ کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی کہ جہاں جیسا موقع ملا ویسا جواب دے کر چھٹکارا حاصل کرلیا جائے۔۔

بہرصورت یہاں سیکولر جمہوری نظام کی تائید کی تین وجہ بتا رہے ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ملک کے سامنے موجودہ دو آپشنوں میں سے یہ آپشن بہتر آپشن ہے۔ یہاں غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا یہ کوئی شرعی دلیل ہے جب آپ کو اقرار ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کی بنیاد حاکمیت الٰہ کے انکار پر رکھی گئی ہے تو اس کی تائید کیلئے آپ کی بتائی وجہ کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ دو شیطان الوہیت کے دعویدار ہیں ان میں سے ایک کی اطاعت آپ نے محض اس بنیاد پر قبول کرلی کہ وہ کچھ زیادہ سہولت مہیا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔

اس وقت ملک میں جب دعوت اسلامی کو ایک آپشن کی حیثیت میں انھیں ابھارا جاسکا تو مزید شدت کے ساتھ دعوت اسلامی یعنی نظام اسلامی کی افادیت، ضرورت اور اہمیت باشندگان کے سامنے پیش کرنی تھی۔ جس موقع پر اہل ملک کے سامنے یہ سوالیہ نشان آئے کہ ملک کی نجات کس فارمولہ میں ہے؟ اس وقت ہم بھی دوسروں کی آواز میں آواز ملا کر بولیں کہ نجات وفلاح کی راہ یہ نہیں ہے جبکہ وہی وقت تھا کہ ہم کہیں کہ لوگو! تمہاری نجات اور سلامتی نہ ہندوتوا میں ہے اور نہ سیکولر جمہوریت میں ہے۔ تمہاری سلامتی اسلام میں ہے اور اسلام کے علاوہ سارے سسٹم اور نظام تباہی اور بربادی کی طرف لے جائیں گے۔ افسوس ہے کہ بات کہنے کا جو وقت ہوتا ہے اس وقت کو ہم نہ صرف کھودے رہے ہیں، بلکہ اُلٹی بات کہتے ہیں اور اپنی اصل بنیاد کو ڈھادیتے ہیں۔ دوسری وجہ کے سلسلہ میں یہ سوال ہے کہ حاکمیت الٰہ کا انکار کرنے والے نظام کی تائید وحمایت موقتی طور پر بھی کیسے کی جاسکتی ہے اور پھر وہ کونسا وقت اور وہ کس طرح آئے گا کہ آپ حاکمیت الٰہ کے نظریہ پر

مبنی نظام کی بات کریں گے۔ جن اسباب اور حالات کی بناء پر اس وقت غیر الٰہی نظام کی تائید وحمایت کر رہے ہیں وہ حالات مزید ابتر نہ ہوں گے۔ جس مصلحت اندیش طرز فکر نے انحطاط کی اس منزل تک پہنچایا ہے وہ بھی حوصلہ مندی اور ایسی جرأت نہ پیدا کر سکے گا کہ حالات کے علی الرغم صدائے لا الہ الا اللہ بلند کر سکیں تیسری وجہ پر بھی غور کیجئے جب تک آپ کوشش کرتے رہیں گے کہ ہندوستانی ریاست کا سیکولر جمہوری کردار باقی رہے اس وقت تک حاکمیت الٰہ کے نظریہ کی بات کیسے کریں گے ایک طرف حاکمیت جمہور کی حمایت کریں اور دوسری طرف حاکمیت الٰہ کی بات کریں۔ یہ دونوں کام ایک ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں بیک وقت ربِ موسیٰ اور فرعون دونوں کی اطاعت کا نعرہ کبھی نہ لگایا گیا ہے اور نہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ محض شیطانی منطق ہے جس کا مقصد لوگوں کا منہ بند کرنا ہے اور بس۔

اعتراض

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں سیکولر جمہوری نظام کے سلسلہ میں جماعت کے اصولی موقف پر اپنے بعض دوستوں کے دو اعتراض کا ذکر فرمایا ہے لیکن ان دوستوں کے اعتراض کی صحیح ترجمانی نہیں کی ہے۔ اعتراض یہ نہیں ہے کہ آپ جمہوری نظام کا تجزیہ کیوں کرتے ہیں۔ بلکہ اصل اعتراض یہ ہے کہ جس غرض کیلئے تجزیہ کرتے ہیں وہ غرض صحیح نہیں ہے۔ نیز اس تجزیہ میں جمہوری نظام کے بعض اجزاء کی تحسین فرماتے ہیں اور بعض کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن حمایت کرتے وقت اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور سیکولر جمہوری نظام کی مکمل تائید وحمایت کرتے ہیں پارلیمنٹ کے کسی امیدوار کی ادھوری حمایت تو نہیں کرتے اور نہ آدھا ووٹ دیتے ہیں۔ ایسی شکل میں آپ کا تجزیہ ایک فعل عبث کے سوا کیا ہوتا ہے۔

ایک سوال اور انصاری صاحب کا جواب

"ایک سوال البتہ یہاں اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا ہندوستان کی پارلیمنٹ اور اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لینے سے اس کے سیکولر جمہوری نظام کو جائز اور برحق ماننا لازم نہیں آتا۔ اگر آتا ہے تو پھر کیا یہ ہمارے عقیدے کے خلاف نہ ہوگا"؟

میں عرض کروں گا کہ اگر ہم اس نظام کے سیکولر کردار اور اس کے حاکمیتِ جمہور کے نظریے

پر اپنی اصولی تنقید کرتے رہیں اور اس نظام کو چلانے کی غرض سے نہیں بلکہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی حفاظت اور انھیں غیر معمولی نقصانات سے بچانے کے لئے الیکشن میں حصہ لیں یا الیکشن کے عمل کو متاثر کرنے کی کوشش کریں تو اس کی وجہ سے اس ملک کے سیکولر جمہوری نظام کو جائز و برحق تسلیم کرنا لازم نہیں آئے گا''۔

یہاں ڈاکٹر صاحب نے گویا سیکولر جمہوری نظام کی حمایت اور تائید کو غلط تسلیم کرلیا ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ اس کے علاوہ ان کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے لیکن موصوف نے صفائی دی ہے کہ ہم دل سے اس نظام کے جائز و برحق ہونے کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے ہماری تائید عقیدہ کے خلاف نہیں ہوگی۔ اس موقع پر ہم عرض کریں گے۔ یقیناً آپ کی یہ بات صحیح ہے اگر دل سے اس کو کوئی جائز اور برحق مانے گا تو اس کے لئے دائرہ اسلام سے باہر ہونے کا اندیشہ ہے مگر عقیدہ کے خلاف عملی مظاہرہ کرنا کفر نہیں تو دائرہ فسق میں چلے جانے کا ڈر تو بہر حال موجود ہے۔ سوچئے کیا یہ معمولی بات ہے جس کے دل میں اللہ کا ذرہ برابر تقویٰ ہوگا وہ اس تصور سے کانپ نہیں جائے گا۔

سورۃ النساء آیت ۶۰ میں طاغوت سے کفر کرنے اور سورۃ النحل آیت ۳۶ میں طاغوت سے اجتناب کرنے کی بات صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ اس روشنی میں اگر کوئی طاغوتی نظام کو دل سے جائز اور برحق نہیں مانتا لیکن اس کی اطاعت کرتا ہے اس سے اجتناب نہیں کرتا تو گویا ایک حکم کو بجالایا اور دوسرے حکم کی خلاف ورزی کی۔

دین میں اس طرز عمل کی کیا حیثیت ہے سب کو معلوم ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ اس عمل کی سنگینی یوں اور کئی گنا بڑھ جاتی ہے کہ یہاں نہ صرف یہ کہ اجتناب کے بجائے اتصال اور قربت کو اپنایا جارہا ہے بلکہ طاغوت سے اتصال اور قربت کے لئے مہم چلائی جاتی ہے جس کے قتال فی سبیل الطاغوت کا ہم معنی بن جانے کا اندیشہ ہے۔

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ. (سورۂ نساء:۷۶)

ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے راستہ میں قتال کرتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ طاغوت کے راستہ میں قتال کرتے ہیں۔

پھر ایک اور پہلو سے معاملہ کو دیکھئے اپنے نفس کو کوئی شخص بھی دل سے نہیں مانتا لیکن نفس کی مطلق اطاعت کو کتنا بڑا جرم بتایا گیا ہے! اس رخ سے ہم دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ سیکولر جمہوری نظام کو خواہ جائز اور حق نہ مانا جاتا ہو مگر اس کے قیام و بقاء اور پھر اس کی تابعداری کرنے اور کرانے کے لئے جدوجہد کی جاتی ہو تو یہ کتنا بڑا سنگین گناہ ہو جاتا ہے اس معاملہ کو اس آیت قرآنی کی روشنی میں دیکھئے۔ اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ۔

انصاری صاحب کا اعتراف

"سیکولر جمہوری نظام پر ہماری تنقید اصلاً دو نکتوں پر ہے ایک یہ کہ اس نظام میں تمام اجتماعی اُمور جو ریاست کے دائرہ میں آتے ہیں، خدا کی ہدایت سے آزاد ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نظام میں حاکمیت خدا کی نہیں انسانوں کی ہوتی ہے۔ درآں حالیکہ اس زمین میں انسان کا مقام حاکم کا نہیں خدا کے خلیفہ یا نائب کا ہے۔ یہ بات ہمارے لٹریچر میں بھی کہی گئی ہے اور ہماری شوریٰ کی قراردادوں میں بھی ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ ہندوستان کے سیکولر نظام کے کچھ محاسن بھی ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے اور جن کی بناء پر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس نظام کی جگہ دوسرا نظام نہ آئے، جس کی بناء پر ہندو مذہب اور ہندو کلچر کا غلبہ ہو اور جس کا کردار جمہوری کے بجائے آمرانہ اور فسطائی ہو، لیکن سیکولر جمہوری نظام پر ہماری اصولی تنقید کی روشنی میں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم اس نظام کو جائز اور صحیح قرار دیں اور اس کو چلانے کیلئے اس کی پارلیمنٹ اور اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیں۔ ایسا کرنا ہماری بنیادی فکر اور ہمارے عقیدۂ توحید کے خلاف ہوگا۔ اسی بات کی صراحت ہمارے لٹریچر نے بھی کی ہے اور شوریٰ کی روداد میں بھی اس موقف کا اعادہ دو ٹوک الفاظ میں کیا گیا ہے۔

البتہ جو بات شوریٰ کے زیر بحث رہی ہے وہ یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں ایسے حالات ہیں یا پیدا ہو سکتے ہیں جن میں ہم ہندوستانی نظام کو چلانے کیلئے نہیں، صرف اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی حفاظت کے لئے یا اسلام اور مسلمانوں کو غیر معمولی نقصانات سے بچانے کیلئے الیکشن میں حصہ لے سکیں یا انتخابی عمل کو متاثر کرنے کی کوشش کریں"۔

تحریک کی عمارت کو منہدم مت کیجئے

اس اقتباس میں ڈاکٹر صاحب نے صاف طور پر اعتراف کیا ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کو

جائز اور حق ماننا اور اس کو چلانے کے لئے پارلیمنٹ اور اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینا ہماری بنیادی فکر اور ہمارے عقیدۂ توحید کے خلاف ہے۔ اس سیاق میں جو سوال پیدا ہوتا ہے وہی اصل سوال ہے کہ کیا مفادات کی حفاظت اور نقصانات سے بچنے کے لئے بنیادی فکر کو چھوڑا جا سکتا ہے اور اپنے عقیدۂ توحید کی خلاف ورزی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس سوال کا جواب کتاب وسنت کی روشنی میں تلاش کیا جائے۔ ساری بحث کا دارومدار اسی جواب پر ہوگا۔ عقیدہ کے خلاف یعنی کلمۂ کفر زبان پر لانے کی رخصت دی گئی ہے۔ لیکن کسی خاص حالت میں۔ مستقل طور پر کلمۂ کفر زبان سے ادا کیا جاتا رہے یا اعمالِ شرکیہ کا ارتکاب کیا جاتا رہے اس کی گنجائش شرعی طور پر کہیں سے نہیں ملتی۔ پھر سوچئے کہ آپ اپنی بنیادی فکر اور عقیدہ کو پس پشت ڈال کر کچھ مفادات کے پیچھے پڑ جائیں گے تو آپ کے پاس رہ کیا جائے گا۔ اس طرح کی کسی رخصت سے کوئی فرد فائدہ اٹھا کر پھر اصل عزیمت پر آ سکتا ہے۔ لیکن کسی گروہ کا رخصت کی راہ پر پڑ جانے کے بعد تقریباً مشکل ہے کہ دوبارہ اصل راہ پر واپس آ جائے۔ پھر غور فرمایئے ابھی وہ کون سی آفت اور آزمائش ہے کہ ہم اس رخصت پر عمل کرنے کی سوچ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے تحریک کی عمارت منہدم کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے سیکولر جمہوری نظام کی پارلیمنٹ اور اسمبلی کے انتخابات میں اگر اس نظام کو چلانے کے بجائے صرف اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی حفاظت اور غیر معمولی نقصانات سے بچانے کیلئے حصہ لیا جائے تو اس سے نظام کا جائز و برحق ماننا لازم نہیں آتا''۔
>
> ''اب یہ سوال کہ کیا ہندوستان کے حالات ایسے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی حفاظت یا انھیں غیر معمولی نقصانات سے بچانے کیلئے انتخابات میں حصہ لینا چاہئے۔ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں فیصلہ جماعت اسلامی کی حد تک اس کی وہی ہیئت کرے گا جو اس کے دستور کے مطابق ایسے فیصلے کرنے کے مجاز ہے۔ یعنی جماعت کی شوریٰ اور بعض حالات میں نمائندگان۔ یہ کام نہ رکن کے کرنے کا ہے نہ کسی مقامی یا حلقے کی جماعت کا''۔

یہ صحیح ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے سے سیکولر جمہوری نظام کو جائز و برحق ماننا لازم نہیں آتا۔ بشرطیکہ اس کا سب کو شعور ہو، اور لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ نظام کافرانہ نظام ہے اور اس کو چلانے کی کوشش کرنا عقیدہ کے خلاف ہے۔ پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کچھ مفادات کے حصول کے لئے

اور کچھ نقصانات سے بچنے کے لئے عقیدہ کے خلاف عمل کرنے کی اجازت کی شرعی نوعیت کیا ہے۔ وہ بھی .... جب کہ اجتماعی طور پر عقیدہ کے خلاف مظاہرہ کیا جائے۔ اس نقطہ نظر سے آپ سوچیں گے تو اس کو اضطراری حالت کہہ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اجتہادی مسئلہ جو کچھ رہ جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ کیا ہم ایسے حالات سے گذر رہے ہیں جن میں کلمۂ کفر زبان سے ادا کرنا جائز ہوجاتا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس حالت میں کلمۂ کفر زبان پر لانا جائز ہوتا ہے کیا اس حالت میں کفر کی دعوت دینا یا نظام کفر کے قیام وبقاء کے لئے مہم چلانا بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ یہاں سیکولر جمہوری نظام کے قیام وبقاء کے لئے صرف ووٹ ہی نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس کے لئے عوام الناس کے اندر مہم چلائی جاتی ہے۔

اجتہادی مسئلہ وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں کتاب وسنت سے بصراحت کوئی حکم معلوم نہیں ہوتا۔

سیکولر جمہوری نظام طاغوتی اور کافرانہ نظام ہے وہ ڈاکٹر صاحب کی بحث کے بعد کوئی مختلف فیہ مسئلہ اب ہمارے درمیان نہیں رہا۔ پھر بھی ''اِنِ الْحُكْمُ''، ''اِلَّا لِلّٰهِ'' اور ''فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ'' جیسی آیات دلیل کے لئے کافی ہیں۔

طاغوت اور طاغوتی نظام کے ساتھ کفر کرنے اور اس سے اجتناب کا مسئلہ بھی سورۃ النساء آیت ۶۰ اور سورۃ النحل آیت ۳۶ کی روشنی میں، نہ مختلف فیہ ہے اور نہ اجتہادی مسئلہ ہے۔

اسی طرح مسرفین، کافرین اور اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت سے آزاد نظام کی اطاعت سورۃ الشعراء آیت ۱۵۱، سورۃ النساء آیت ۵۹، سورہ محمد آیت ۲۶۔ سورۃ آل عمران آیت ۴۹ اور سورۃ الفرقان آیت ۵۲ کی روشنی میں ممنوع اور حرام ہے۔ ان قرآنی دلائل کے بعد یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کے قیام وبقاء کیلئے ووٹ دینا اور اس کے واسطے مہم چلانا ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق عقیدہ سے نہیں بلکہ حکمت عملی سے ہے جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا۔

اجتہادی مسئلہ جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ کیا ہماری حالت حالت اضطرار ہے۔ جس میں کلمۂ کفر زبان پر لانا اور مردار کھانا جائز ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ مسئلہ کا کوئی جزء بھی اجتہادی نہیں ہے ہر جزء سے متعلق قرآن کی نص موجود ہے۔ اگر یہ اجتہادی مسئلہ ہے تو تروپتی، بنارس، ہردوار اور متھرا

میں جو مشرکانہ مراسم ادا کئے جاتے ہیں ان کے مشرکانہ ہونے کے لئے نص قطعی نہیں پیش کی جاسکتی۔ پھر ہندوستان میں بُت پرستی بھی ایک اجتہادی مسئلہ بن جائے گا۔

مجلس شوریٰ کی حیثیت

رہا یہ سوال کہ اجتہادی مسئلہ میں فیصلہ کون کرے گا، بڑا اہم سوال ہے۔ آپ خود فرمائیں کہ مجلس شوریٰ کے ارکان کے انتخاب میں دستوری اعتبار سے صرف یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ موجودہ ارکان جماعت میں کون نسبتاً تقویٰ، اخلاص، فہم وفراست میں بہتر ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس کے اندر شرعی اجتہاد کرنے کے شرائط ہیں۔ یہ بڑی زیادتی اور بھیانک غلطی ہوگی کہ جو باڈی محض جماعتی مشنری اور نظم چلانے کے لئے منتخب کی جاتی ہے اس کے ذمہ اجتہاد اور استنباط کا کام سونپ دیا جائے جبکہ روزمرہ کے صوم وصلوٰۃ اور زکوٰۃ وحج سے متعلق مسائل میں بھی ارکان شوریٰ کی طرف رجوع کرنا عموماً مناسب نہیں سمجھا جاتا اور نہ وہ خود اپنے کو اس کا اہل سمجھتے ہیں چہ جائے کہ کسی اجتہادی مسئلہ میں ان پر بھروسہ کیا جائے۔ اجتہاد اور استنباط کے لئے علماء اور فقہاء نے کئی شرائط بتائی ہیں جن میں کم ازکم ان کے اندر راست کتاب وسنت سے استفادہ کی صلاحیت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ مفسرین کی تفاسیر، شارحین حدیث کی شروح، فقہاء مجتہدین اور اصولیین کی اصولی مباحث اور تفریعات پر ان کی نظر ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ جن اُمور اور مسائل میں کتاب وسنت کی کوئی نص نہ ملے ان میں مجلس شوریٰ کسی ایسی ہیئت یا مجلس کی طرف رجوع کرے جس کے ارکان شرائط اجتہاد واستنباط کو ملحوظ رکھتے ہوئے منتخب کئے گئے ہوں۔ جماعت کی مجلس شوریٰ کو مجلس افتاء کا درجہ دینا اور اس کی طرف کسی اجتہادی مسئلہ میں رجوع کرنا اور اس کے فیصلہ کو شرعی حیثیت دینا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے مسائل نماز میں مسجد کی کمیٹی کو اصل قرار دیا جائے اور علماء کی طرف رجوع کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔

علماء کا معاملہ

ووٹ دینا عقیدہ کے خلاف ہے اس کی تائید میں مولانا مودودیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ، مولانا سید حامد علیؒ اور مولانا عروج قادری کی رائیں موجود ہیں۔ ان کے مقابلہ میں کسی قابل ذکر معتبر عالم رکن شوریٰ کی رائ منظر پر اب تک نہیں آئی ہے۔

تحریک اسلامی کا مرکزی نکتہ کیا ہے

انحراف کی دو علامتیں

''زندگی نو'' جولائی ۹۸ء میں برادر محترم ریاض احمد صاحب کا ایک مضمون ''دعوت اسلامی کے مراحل'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ عنوان اور مضمون میں باہمی کیا تعلق ہے مضمون کا اصل پس منظر یہ ہے کہ ہندوستان میں تحریک اسلامی کے دو فیصلوں کیلئے دلیل فراہم کی جائے۔ ایک موجودہ الیکشنی سیاست میں اس فارمولہ کے ساتھ شریک ہونا کہ سیکولر گروپوں کی تائید میں ووٹ دیا جائے اور عام ہندوستانی باشندوں کو یہ بتایا جائے کہ ہندوستان کے سیکولر جمہوریت کا تحفظ انتہائی ضروری ہے ورنہ ملک کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ دوسرا فیصلہ فورم برائے جمہوریت کا قیام ہے جس کا مقصد ہندوستانی جمہوریت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ملک کی تعمیر دستور ہند کے مطابق کرنی ہے۔ یہ دونوں فیصلے اس بات کی بڑی علامت بن گئے ہیں کہ تحریک اسلامی ہندوستان میں اپنے محور سے ہٹ چکی ہے اور کتاب وسنت اور خود اپنے دستور سے انحراف کر رہی ہے۔

ہمارے دوستوں کی اُلجھن

ریاض احمد صاحب کا مضمون دراصل اسی تاثر کو ختم کرنیکی غرض سے لکھا گیا ہے اس مقصد کے لئے کئی لوگوں نے نت نئی دور دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی کوڑی اور کوئی گوٹی جمتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ بلکہ ایک ہی بات کو ثابت کرنے کے لئے لکھنے والے ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ بعض دوستوں نے بڑے طمطراق سے کہا کہ مولانا مودودیؒ کا ایک اجتہاد تھا۔ اور اب یہ ہمارا اجتہاد ہے۔ مگر یہ بات چل نہ سکی۔ اس لئے کہ مولانا مودودیؒ کا اجتہاد کتاب وسنت کی روشنی میں تھا۔ اور ہمارے ان دوستوں کے اجتہاد کی کوئی شرعی بنیاد نہیں تھی۔ اور نہ انھوں نے اجتہادی اصولوں کی رعایت ملحوظ رکھی تھی۔ ان کا سارا سرمایہ کچھ صحافیوں کے تبصرے اور کچھ تجزیہ نگاروں کی نگارشات تھیں۔ اسی طرح بعض لوگوں نے سیکولرزم اور جمہوریت کی تشریح اور تعبیر اس انداز سے شروع کی کہ گویا انھوں نے بڑا تیر مارا ہے یہ ثابت کر کے کہ سیکولر جمہوریت اور اسلام میں

کوئی ٹکراؤ کی بات نہیں ہے مگر یہ دلیل بھی اپنا کوئی اثر دکھاتی ہوئی نظر نہیں آئی۔ باہر کے لوگ کہنے لگے اب جماعت اسلامی قومی ڈگر پر آرہی ہے اور اندر کے لوگوں نے کہا کہ اب تو ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے پچاس برس پہلے نیشنلسٹ اور کانگریسی مسلمانوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اندر اور باہر کی اس آواز کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس پس منظر میں ہمارے بعض انتہائی مخلص حضرات نے سیکولر جمہوریت کی اصلیت اور حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے نئے انداز سے اپنی بات پیش کرنے کی کوشش کی ہے انھیں میں برادر محترم ریاض احمد صاحب ہیں۔ لیکن ذرا بھی غور وفکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ محترم نے اپنے مقدمہ کو مضبوط تو نہیں کیا البتہ اپنے کئی ہمنواؤں کے دلائل کو رد کر دیا ہے۔

باطل کی زمرہ بندی

ریاض احمد صاحب لکھتے ہیں:

"قرآن کریم میں انبیائے کرام کی بعثت اور دعوت کے بنیادی اور مرکزی نکتے کو یوں واضح کیا گیا ہے"۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (سورۃ النحل:۳۶)

ترجمہ: ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سب کو خبردار کیا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ

ترجمہ: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔

اللہ کی عبادت کرنے اور طاغوت کی عبادت واطاعت سے بچنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اہل ایمان اللہ، اس کے رسول اور اس کی کتاب کی اتباع کریں اور اس کے علاوہ کسی اور طریقے پر نہ چلیں۔ اپنے باہمی اختلافات کے فیصلے اور مسائل کے حل کے لئے اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کریں۔ اس پر راضی ومطمئن رہیں، پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو کر شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے بچیں۔ جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے یوں دیا ہے:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ (سورۂ اعراف:۳)

ترجمہ: لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ (سورۂ شوریٰ:۱۰)

ترجمہ: "تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (سورۃ البقرہ:۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو، کیوں کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

قرآن کے درج بالا احکام کا واضح تقاضہ یہ ہے کہ اللہ کا پسندیدہ دین اسلام، عملاً اس دنیا میں نافذ و جاری ہو۔ کیوں کہ اس کی اقامت و نفاذ کے بغیر اس دنیا میں اللہ کی کامل عبادت و اطاعت اور طاغوت کی عبادت و اطاعت سے مکمل اجتناب ناممکن ہے۔ اعتقاداً اور اصولاً اللہ کی عبادت و اطاعت کا اقرار اور طاغوت کی عبادت و اطاعت سے انکار تو ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حالت میں ممکن ہے لیکن عملی دنیا میں طاغوت کی اطاعت سے مکمل آزادی اور نجات، اقامت دین اور غلبۂ دین کے بغیر ممکن نہیں اور یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کسی بھی ملک یا جگہ پر اقامت دین، غلبہ دین کی جدوجہد اور دعوت کے عملاً شروع ہوتے ہی دین غالب نہیں ہو جاتا بلکہ دعوت کی ابتداء اور دین کے بالفعل قیام میں ایک مدت اور وقفہ لازماً درکار رہتا ہے اور اس درمیانی مدت اور وقفے میں سرزمین دعوت پر کوئی نہ کوئی باطل یا غیر اسلام کا غلبہ ہوتا ہے اور داعی کو غلبے دین کی جدوجہد کا آغاز نظام باطل کے غلبہ کے تحت اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور سہولتوں میں رہ کر ہی کرنا پڑتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ حق متعدد شکلوں کا نہیں بلکہ ایک ہوتا ہے۔ لیکن حق کے مقابلے میں باطل کی ہزاروں شکلیں صرف ممکن نہیں بلکہ عملاً یا بالفعل دنیا میں پائی بھی جاتی ہیں اور ان مختلف قسم کے باطل نظاموں میں دعوت اسلامی کے نقطہ نظر سے کوئی نوے فیصد باطل ہوگا، کوئی پچاس فیصد، کوئی دس فیصد اور کوئی اس سے بھی کم۔ نظری اور اُصولی حیثیت سے باطل کی یہ تمام قسمیں داعی کی

نظر میں طاغوت اور باطل کے حکم میں داخل وشامل ہیں اوران سب کو مٹانا اوران کی جگہ پر، دین اسلام کا قیام ہی اس دنیا میں داعی کا مقصد اور نصب العین ہے''۔

ریاض احمد صاحب کی پیش کردہ آیات پر غور

اس پوری عبارت پر غور کیجئے۔ پہلی آیت ''وَلَقَدْ بَعَثْنَا ''میں اللہ تعالیٰ نے دو حکم فرمائے ہیں اول یہ کہ اللہ کی عبادت کرو اور دوسرا حکم ہے کہ طاغوت سے اجتناب کرو۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ حکم ایک ہی ہے جسے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ طاغوت سے اجتناب عبادتِ الٰہی کا ایک جزء ہے جیسے کلمہ توحید منفی اور مثبت دو باتوں سے مکمل ہوتا ہے اور لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللہ میں سے کسی ایک جزء کا بھی انکار کرنے والا توحید پرست نہیں کہا جائے گا اسی طرح عبادت الٰہی اور اجتناب طاغوت میں سے کسی ایک جزء کو بھی نظر انداز کرنے والا شخص فرمان الٰہی کا ماننے والا اور انبیائی دعوت کا علمبردار نہیں کہا جاسکتا۔ کوئی فرد یا گروہ عبادت الٰہی کا دعویٰ کرے اور ساتھ ہی طاغوت سے اجتناب کرنے کے بجائے طاغوت سے وابستہ ہو اور نظام طاغوت کا حامی، موید اور شریک ہو تو اس کی عبادت میں نقص ہوگا اور اسے خالص نہیں کہا جاسکے گا بلکہ دو دو چار کی طرح یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے انبیائی مشن اور مقصد کے بنیادی اور مرکزی نکتہ سے اپنی نظر ہٹالی ہے طاغوت کیا ہے اور کیا نہیں اس میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس امر میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ طاغوت سے اجتناب کرنا اللہ تعالیٰ کا ایک اہم حکم ہے اور انبیائی دعوت کا ایک جزء نہیں بلکہ نصف جزء ہے۔ حکمت عملی اور طریقہ کار کا حصہ نہیں ہے۔ کہ کوئی کہے کہ طاغوت سے اجتناب کرنے کے بجائے حکمت عملی کے تحت طاغوت سے وابستہ ہونا خاص حالات کے پیش نظر ضروری ہے۔ طاغوت سے اجتناب کا حکم قرآن یعنی دلیل قطعی سے ثابت ہے۔ اس لئے اس کا تعلق حکمت عملی سے نہیں، عقیدہ سے ہے۔ اس پر صرف عمل کرنا فرض نہیں ہے بلکہ اس کو دل سے ماننا اور تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔

اب اگر آپ سیکولر جمہوری نظام کو طاغوت سمجھتے ہیں تو آپ کو اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ موجودہ الیکشنی سیاست میں داخل ہوکر کسی امیدوار کو ووٹ دینا اور طاغوتی نظام کی تشکیل میں حصہ لینا کیونکر جائز ہوگا اور آپ کا یہ دعویٰ کیسے صحیح ہوگا کہ ہم قرآن کے خلاف نہیں جارہے ہیں۔

طاغوت سے اجتناب کا حکم دلیل قطعی سے ثابت ہے اس لئے اس کے خلاف طرز فکر وعمل اختیار کرنے کے لئے ''دلیل قطعی'' قرآن سے دلیل لانی پڑے گی۔ قرآن کے صریح اور واضح حکم کے مقابلہ میں قرآن کے علاوہ کوئی دوسری دلیل استدلال کی دنیا میں مانی نہیں جاتی ہے قرآن کے مقابلہ میں تاریخ وسیر کے واقعات نہیں پیش کئے جاسکتے کیونکہ ان میں بہت سارے احتمالات ہوسکتے ہیں اور قرآن کا بیان احتمالات سے پاک ہے۔

طاغوت سے اجتناب کا حکم جان لینے کے بعد یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ اجتناب کا کیا مفہوم ہے۔ قرآن میں کئی مقامات پر اجتناب کا لفظ آیا ہے ان کو دیکھنے سے اجتناب کا مفہوم اور مطلب بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً سورۃ المائدہ آیت ۹ میں شراب اور جوا کو ''رِجسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیطَانِ'' کہا گیا ہے پھر حکم دیا گیا اس سے اجتناب کرو۔ اسی لئے شراب کا بیچنا، خریدنا، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ اس کو لانا اور لے جانا وغیرہ ساری چیزیں ممنوع قرار پائی ہیں اس حکم کے بعد کوئی شخص شراب خانہ اور جوا خانہ تعمیر کرے یا کرائے اور اس کے نظم ونسق کو چلانے میں ممدومعاون بن کر حصہ لے تو کیا آپ اس کے جواز کا فتویٰ دیں گے؟ اگر شراب خانہ اور جوا خانہ چلانے کی گنجائش نہیں ہے تو طاغوت خانہ بنانے اور چلانے کی گنجائش کہاں سے پیدا ہوتی ہے جبکہ شراب اور طاغوت دونوں سے دور رہنے کے لئے ایک ہی لفظ اور صیغہ ''فَاجْتَنِبُوْهُ'' استعمال ہوا ہے اور جس طرح شراب سے اجتناب کا حکم صریح ہے اسی طرح طاغوت سے اجتناب کا حکم بھی صریح ہے نہ کسی تاویل کی گنجائش ہے اور نہ کسی توجیہ کی۔ لہٰذا شراب اور طاغوت میں فرق نہیں ہوسکتا۔ یہ کہنا کہ ہر باطل اور ہر طاغوت برابر نہیں ہوتا اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ نہیں کیا جاسکتا بالکل درست ہے۔ آپ سب سے اجتناب کرنے میں برابری نہ کیجئے۔ لیکن اجتناب کو اتصال سے بدل تو نہیں سکتے اس کا جواز کہاں سے لائیں گے کہ طواغیت میں سے کسی طاغوت کے ساتھ اجتناب کے بجائے اتصال، قربت اور دوستی کا رویہ اپنالیں۔ اجتناب کے لئے قرآنی آیت موجود ہے اتصال کے لئے بھی قرآن میں کوئی آیت تلاش کرنی پڑے گی۔ اجتناب کی کیفیت اور کمیت میں فرق ہوسکتا ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ اجتناب کے بجائے اتصال پیدا کرلیا جائے اور پھر دعویٰ ہو، اتباع قرآن کا۔

ریاض احمد صاحب کی پیش کردہ دوسری آیت میں عبارت اور اللہ کے الفاظ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلی آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہی بات اس آیت میں بھی کہی گئی ہے یعنی اللہ کی عبادت کا حکم اور غیر اللہ کی بندگی اور غلامی کی نفی۔

تیسری آیت

اسی طرح تیسری آیت ''اِتَّبِعُوْا'' میں اللہ کی نازل کردہ شریعت کی اتباع کا حکم ہے جس کا مفہوم بالکل واضح ہے دوسرا حکم اللہ کے علاوہ دوسرے اولیاء کی پیروی نہ کرنے کا حکم ہے۔ اس کی صورت اس کے سوا کیا ہوگی کہ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر غیر اللہ کے بنائے ہوئے دستور اور قانون کی پیروی نہ کی جائے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے ضابطۂ حیات اور رسول خدا کی سنت کی موجودگی میں دنیا کے کسی بھی ضابطہ اور قانون کی پابندی اختیار کرنے کے معنی اللہ کے علاوہ دوسروں کو اولیاء بنانا اور ان کی اتباع اور پیروی کرنا ہے اسی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ قانون ساز اداروں کی تشکیل اور ان کے ممبران کا انتخاب کرنا اللہ کے علاوہ دوسروں کو اولیاء بنانا اور ان کی اتباع اور پیروی ہے جس سے قرآن نے صراحت کے ساتھ منع کیا ہے تو اس کا انکار آپ کیونکر کرسکتے ہیں۔ انھیں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر بانی تحریک نے لکھا تھا

> ''اس نظریہ سے ہٹ کر اول الذکر جمہوری نظریے کو قبول کرنا گویا عقیدۂ توحید سے منحرف ہوجانا ہے اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانہ کے جمہوری اصولوں پر بنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لئے ووٹ دینا حرام ہے''۔
>
> (رسائل ومسائل اول صفحہ ۳۰۷)

مزید تفصیل کے لئے اسی کتاب میں صفحہ ۳۴۵ پر پڑھئے ''جماعت اسلامی کا مسلک''۔

خطواتِ شیطان

''اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً'' والی آیت کو دیکھئے دین میں پورے کے پورے داخل ہونے اور شیطان کے خطوات کی پیروی نہ کرنے دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے دین میں پورے کا پورا داخل ہونے کی صورت کیا ہے اور اس کا تقاضہ کیا ہے اسی طرح خطوات الشیطان کیا ہیں جن کی پیروی سے منع کیا گیا ہے۔

شریعت الٰہی کے علاوہ دنیا کے طور طریقے، قانون اور دستور کے علاوہ وہ کونسی چیزیں ہیں جو خطوات الشیطان ہوں گی۔ پھر خدا اور رسول سے بے نیاز ہو کر ضوابط و قوانین بنانے والے کیا شیطان نہیں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کا جواب نفی میں نہیں دیا جا سکتا اب بتایئے کہ شیطان اور خطوات الشیطان کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور آپ اپنی اسمبلی، پارلیمنٹ اور اپنے امیدواروں کو کس بنیاد پر اس دائرے کے باہر نکال سکیں گے اور پھر آپ ووٹ دے کر کس طرح دین میں پورے کے پورے داخل ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور کیونکر خطوات الشیطان کی اتباع کرنے کے الزام سے اپنے آپکو بچا سکیں گے بڑا ہی نازک مقام ہے ذرا سوچیے ہمیں خدا کے سامنے اس الزام سے بچنا ہے۔

اس طرح ذرا گہرائی میں جائیں تو ریاض احمد صاحب کی ساری باتوں کی تردید کے لئے صرف یہ آیت کافی ہے جناب نے باطل اور طاغوت کی نوے فیصد اور دس فیصد کی جو تقسیم کی ہے وہ اس آیت کی روشنی میں بے فائدہ ہو جاتی ہیں۔ یہ آیت اعلان کرتی ہے کہ تم پورے کے پورے دین میں داخل ہو جاؤ۔ نوے فیصد طاغوت کو بھی چھوڑو اور دس فیصد طاغوت کو بھی چھوڑ دو۔ بڑے بُت کی پوجا بھی ترک کرو اور چھوٹے بُت کی پوجا سے بھی باز رہو۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایئے، اگر کوئی شخص نوے فیصد طاغوت سے کفر اور اجتناب کرتا ہے لیکن دس فیصد طاغوت پر ایمان رکھتا ہے اور اس سے اجتناب کے بجائے اس کو سینے سے لگاتا ہے تو کیا وہ "اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ كَافَّةً" کا قرآنی مطالبہ پورا کرتا ہے یا اس کو ٹھکرا رہا ہے اور کیا وہ "تُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضٍ وَّتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ" کا اپنے آپ کو مصداق نہیں بنا رہا ہے؟؟

ریاض احمد صاحب نے مذکورہ بالا تحریر میں ایک سوال یہ بھی اٹھایا ہے کہ "اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ كَافَّةً" کا حکم کس دور کیلئے ہے۔ غلبہ دین کے دور کیلئے ہے یا غلبہ دین سے پہلے والے دور میں بھی یہ حکم لاگو ہوگا اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ حکم غلبہ دین کی صورت حال کیلئے ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ آج کے دور میں اجتناب طاغوت کا حکم کالعدم ہو جائے گا اور جو لوگ دین میں پورے کے پورے داخل ہونے اور طاغوت سے اجتناب کی رٹ لگائے ہوئے ہیں ان کی سوچ غلط ہے اور ان کی تحریک بے بنیاد تحریک ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ حکم ہر زمانہ ہر حالت کیلئے ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ طاغوت سے کفر اور اجتناب کرنے کے بجائے آپ طاغوت سے اتصال، وابستگی اور طاغوت

کی تائید وحمایت کی مہم چلانے کی بات کہاں سے لا رہے ہیں۔ تعجب ہے برسہا برس سے تحریک اسلامی سے وابستہ لوگ اس حد تک تضاد فکری کے شکار ہو چکے ہیں اور انھیں احساس تک نہیں۔

تضاد کی مثال

دین حق کے سوا سارے ادیان اور نظامہائے زندگی کو باطل اور برسر غلط ماننا اور کہنا ان سب کو مٹانا اور ان کی جگہ دین اسلام کا قیام ہی اس دنیا میں داعی کا مقصد اور نصب العین قرار دینا ایک طرف اور دوسری طرف باطل کی بعض قسموں کو تحفظ دینے اور برسر اقتدار لانے کے لئے جدوجہد اور مہم چلانا۔ کیا دونوں میں تضاد نہیں ہے اور کیا یہ دونوں کام ایک ساتھ ہو سکتے ہیں۔ اسی عملی دشواری کی وجہ سے سیکولر جمہوریت کے تحفظ اور بقاء کی مہم کے دوران آپ کو کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے لئے یہی باطل "سیکولر جمہوریت" موزوں نظام ہے اور ہندوستان کی سلامتی اس کے بغیر باقی نہیں رکھی جاسکتی۔ اس کے خلاف موقف اختیار کرنے کا مطلب ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ دیکھو یہ زہریلا سانپ ہے اور پھر دوسرے لحمہ میں کہے کہ اس کو گود میں رکھ لو ورنہ مر جاؤ گے۔ تو ظاہر ہے اس طرح کی متضاد باتیں کوئی سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا اور کہنے والے کو پاگل سمجھے گا اسی بناء پر الیکشن کے زمانہ میں بیداری کی مہم چلانے کے دوران ہماری طرف سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر اور رہتی دنیا کے لئے نظام زندگی ہے اور دنیا اور آخرت کی فلاح اور کامرانی بلا قید زمان ومکان اسلام میں ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ سیکولرازم کے علاوہ ملک کے لئے اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے کوئی راہِ نجات نہیں ہے باطل کی مختلف قسموں کے درمیان فرق کرنے کا جہاں تک سوال ہے اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے اور ہونی چاہئے کہ جو نوے فیصد باطل ہے اس کو دفع کرنے کے لئے نوے فیصد اپنی قوت لگائی جائے اور جو دس فیصد باطل ہے اس کو توڑنے کے لئے دس فیصد قوت صرف کی جائے۔ یعنی بڑے بُت پر بڑی کلہاڑی سے وار کیا جائے اور چھوٹے بُت کو توڑنے کے لئے چھوٹی کلہاڑی استعمال کی جائے۔ لیکن اس طرح کا فرق کرنا کہ بڑے بُت کی پوجا نہ کی جائے مگر چھوٹے بُت کو تحفظ دیا جائے اور اس کے سامنے سجدہ روا رکھا جائے اور کہا جائے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ حالات کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری ہے۔ غرض یہ کہ اس طرح کا فرق کرنا جس طرح بڑے اور چھوٹے بُت کے درمیان کرنا غلط ہے جس کے لئے

انبیائی تاریخ سے کوئی دلیل لائی نہیں جاسکتی۔ اسی طرح بڑے اور چھوٹے طاغوت کے درمیان فرق کرنا غلط اور بے بنیاد بات ہے۔

قرآن نے طاغوت سے اجتناب کا حکم بلاتفریق دیا ہے اس لئے جس طرح صنم پرستی خلاف توحید ہے خواہ بُت بڑا ہو یا چھوٹا اسی طرح طاغوت کا اقرار اور اس سے وابستگی منافی ایمان ہے خواہ طاغوت نوے فیصد کا ہو یا دس فیصد کا۔

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ دس فیصد طاغوت سے وابستگی کے لئے صرف جواز کے ہی لئے کوشش نہیں ہورہی ہے بلکہ اس وابستگی کو تقاضائے ایمان اور تقاضائے عقل وبصیرت ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے اگر آپ جس طرح طاغوت سے اجتناب کے لئے قرآن کی آیت پیش کرتے ہیں طاغوت سے وابستگی اور طاغوتی نظام کے قیام وبقاء کے لئے بھی کوئی قرآنی آیت تلاش کر کے پیش کردیں۔

چھوٹا اور بڑا باطل

ریاض احمد صاحب لکھتے ہیں:

> ''چنانچہ داعی اپنے مقصد ونصب العین کی نظری واصولی وضاحت کے وقت بلاتفریق اگر طاغوت کی ان سب اقسام کے باطل اور برسرغلط ہونے کا اعلان کرتا ہے تو وہیں قیام دین کی عملی جدوجہد کے وقت، عملی نقطۂ نظر سے ان مختلف اقسام کے باطل کے درمیان فرق کرنا اس کے لئے لازمی وناگزیر ہوتا ہے۔ کیونکہ عمل اور معاملے کے لحاظ سے ان سب کو ایک درجہ میں رکھنا اور سب کے ساتھ یکساں معاملہ کرنا حکمت دعوت کے لحاظ سے غلط اور غلبۂ دین کے امکانات کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے آج کے حالات میں، تحریک اسلامی کا تمام باطل نظاموں کو عملی معاملے کے لحاظ سے ایک درجہ میں رکھنا انبیائے کرام کی دعوت اور طریقہ کار کا ناقص مطالعہ فہم، دین کی کمی اور بے بصیرتی کا مظہر ہوگا''۔

صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ فرق کرنا لازمی اور ناگزیر ہے اور فرق نہ کرنا فہم دین کی کمی اور بے بصیرتی کا مظہر ہے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کے مطلق حکم کو مقید کرنے کی کوئی شرعی دلیل پیش کی جائے اور بتایا جائے کہ بڑے اور چھوٹے بُت اور طاغوت میں فرق کرنا قرآن سے ثابت ہے۔

ہماری بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے نجاست کی مثال سامنے رکھئے۔ نجاست اور نجاست کے درمیان کچھ شرعی بنیادوں پر فرق کیا جاتا ہے چنانچہ نجاست غلیظہ اور نجاست خفیفہ میں بعض اعتبار سے فرق کیا گیا ہے مگر کسی شرعی بنیاد پر بلا دلیل نہیں لیکن ایسا فرق کہ نجاست غلیظہ کو نجاست کہا جائے اور اس سے بچا جائے اور نجاست خفیفہ کو طہارت کا درجہ دیا جائے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ وضوء کرنا جائز قرار دیا جائے اس کی نہ کوئی بنیاد ہے نہ کوئی نظیر۔

دو باطل کی جنگ کی صورت میں ہمارا غیر جانبدار رہنا ریاض احمد صاحب کے نزدیک صحیح نہیں ہے ہم عرض کریں گے۔غیر جانبدار رہنے اور خاموش بیٹھنے کی کیا بات ہے مسلمان تو حق کا داعی ہے اسے ہر حالت میں حق کا داعی اور گواہ بن کر رہنا ہے باطل آپس میں برسر جنگ ہوں یا باہم دوستی رکھتے ہوں۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہم اپنے آپ کو کسی باطل کی دعوت اور گواہی دینے کے لئے کیوں مجبور پا رہے ہیں اور اس کے لئے کہاں سے وجہ جواز لا رہے ہیں جب ایک کمیونسٹ کہتا ہے کہ ہندوستان کی نجات کمیونزم میں ہے فسطائی ذہنیت کا ترجمان دعویٰ کرتا ہے کہ ہندوستان کی سلامتی اور نجات ہندوتوا میں ہے اور ایک کانگریسی نعرہ لگاتا ہے کہ ہندوستان کا بھلا سیکولرزم میں ہے تو ہم کیوں نہ یہ آواز لگائیں کہ ہندوستان سمیت ساری دنیا کے لئے نسخۂ شفاء قرآن میں ہے۔ اسلام میں ہے اپنی بات کہنے کے بجائے مختلف باطلوں کے درمیان انتخاب کے چکر میں کیوں پڑے ہیں اور اس کے لئے کیا دلیل ہے اور کون سی نظیر ہے جب باشندگان کے سامنے یہ مسئلہ زیر بحث ہو کہ ہندوستان کی نجات کا کیا راستہ ہے۔ کیا طریقہ ہے۔ دراصل وہی وقت ہوتا ہے اسلام کی دعوت ٹھیک ٹھیک پیش کرنے کا۔ لیکن ہماری یہ کتنی بڑی بدقسمتی اور بے توفیقی ہے کہ ہم اس وقت اسلام کے بجائے سیکولرزم کے لئے مہم چلانی شروع کر دیتے ہیں۔

۶۶ء کا فیصلہ

ریاض احمد صاحب نے اپنے مضمون میں باطل کی تین قسمیں کی ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان تین قسموں کے درمیان فرق نہ کرنا اپنے فرض سے غفلت کے مترادف ہے اور اس غفلت پر آخرت میں اللہ کی گرفت اور مواخذہ سے بچنا ممکن نہیں۔ پھر موصوف نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں اقامتِ دین کی جدوجہد کو لاحق امکانی خطرہ کے پیش نظر جماعت اسلامی نے جولائی ۱۹۶۶ء میں اپنے

طریقہ کار کا یہ نہایت اہم نکتہ اس طرح واضح کیا ہے کہ۔

''موجودہ نظام حکومت کو غیر اسلامی اور خلاف حق سمجھتے ہوئے اس کو اسلامی نظام سے تبدیل کرنے کے لئے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے''۔

''موجودہ نظام کو غیر اسلامی اور خلاف حق سمجھتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے تحفظ کے لئے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے''۔

جماعت کے اندرونی اور بیرونی حالات سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ۱۹۶۶ء کے فیصلہ تک عمومی طور پر کوئی خاص بے چینی اور انتشار فکر نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس فیصلہ میں یہ بات تو نہیں کہی گئی تھی کہ الیکشن میں حصہ لینا شرعی حدود کا لحاظ کئے بغیر بہر صورت جائز ہے اگر ۸۴ء کا فیصلہ ایسا ہوا ہوتا کہ اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہوتی۔ اور بنیادی عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہ ہوتی تو اختلاف میں اتنی شدت نہ پائی جاتی کیونکہ فی نفسہ الیکشن میں حصہ لینے کا اصل مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے کی جو شکل فی الحال اختیار کی گئی ہے کیا وہ صحیح ہے اور کیا کتاب وسنت اور خود دستور جماعت سے متصادم تو نہیں ہے۔

اوپر ہم نے ۱۹۶۶ء کے فیصلہ کی دو دفعات نقل کی ہیں۔ پہلی دفعہ غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام سے بدلنے کے لئے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے اس سے صاف واضح ہے کہ غیر اسلامی نظام کو چلانے کے لئے الیکشن میں حصہ لینا جائز نہ ہوگا چنانچہ یہ بات دوسری جگہ صراحت کے ساتھ کہی بھی گئی ہے اب ذرا بتایئے آپ جب ایک کمیونسٹ کو ووٹ دے کر پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں تو کس لئے بھیجتے ہیں کیا وہ غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام سے بدلنے کے لئے کوشش کرے گا یا غیر اسلامی نظام کو چلانے میں شریک ہوگا اس طرح ۸۴ء کا فیصلہ ۱۹۶۶ء کے فیصلہ کے بھی خلاف ہے پھر آپ کی پوزیشن کیا ہوگی جب کہ آپ کا نمائندہ پارلیمنٹ میں جا کر غیر اسلامی نظام کے چلانے میں شریک ہوتا ہے۔

ریاض احمد صاحب کا اعتراف

ریاض احمد صاحب کی اس عبارت پر بھی غور کیجئے:

''ایک طرف سیکولر جمہوریت اپنے فلسفۂ حیات اور اصل کے اعتبار سے ایک باطل نظام

ہے کیونکہ وہ انسانوں کے اجتماعی وسیاسی معاملات سے خدا اور مذہب کو بے دخل کرتی ہے اور اجتماعی زندگی میں جمہور کی خلافت کے بجائے جمہور کی حاکمیت اعلیٰ کی علمبردار ہے اور اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کی منکر ہے..................دوسری طرف..................''

ان جملوں کے بعد موصوف نے جمہوریت کے کچھ فوائد کا تذکرہ فرمایا ہے ذرا غور فرمایئے۔ یہ مانا کہ جمہوریت کے ایک نہیں لاکھ فوائد ہیں لیکن ان فوائد کے حصول کے واسطے اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے اور اپنی حاکمیت کا دعویٰ کرنے والے نظام کے تحفظ، بقاء اور قیام کے لئے ہم چلا کر خدا کے سامنے کیسے منہ دکھائیں گے اور پھر خلق خدا کے روبرو کیسے یہ دعویٰ لے کر کھڑے ہوں گے کہ ہمارا نصب العین اقامت دین ہے۔ اور ہم یہ سب کچھ زمین پر اللہ کی حاکمیت اور اللہ کا قانون نافذ اور جاری کرنے کے لئے کرتے ہیں یہ کتنا بڑا تضاد ہے۔ جس تضاد اور تناقض کو مسلمانوں کے اندر سے ختم کرنے کے لئے تحریک اسلامی وجود میں آئی تھی۔ افسوس ہے اسی تضاد اور تناقض کے ہم داعی بن گئے۔ عام مسلمان اپنی بے علمی اور بے شعوری کی بناء پر اور احساس گناہ کے ساتھ تناقض میں مبتلا تھا لیکن ہم ہیں جو پورے شعور کے ساتھ اس تناقض کو اپنا رہے ہیں اور اسی میں اپنی، سارے مسلمانوں کی اور پورے ملک کی نجات سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بیسویں صدی کا کوئی المیہ نہیں ہوگا۔

مصنف کی دیگر تصانیف

- دار الاسلام اور دار الحرب
- نظام امارت وخلافت کی شرعی حیثیت
- جاہلیت کے خلاف جنگ
- سیکولر جمہوری نظام، الیکشن اور تحریک اسلامی
- وسائل تربیت
- راہِ سعادت
- بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں
- ملت کے دفاع کا مسئلہ
- زکوٰۃ کی اہمیت
- اسلامی فکر کیا ہے؟
- ہندوستان میں مسلم سیاست
- مساجد اللہ
- مجموں کا مسئلہ (ایک سیر حاصل بحث)
- طاقت کا استعمال قرآن کی روشنی میں

ملنے کے پتے

- مکتبۃ الاقصیٰ — سعید آباد، حیدر آباد
- القلم — سعید آباد، حیدر آباد
- الاصلاح بک سنٹر — اصلاحی مارکٹ، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی